یکم و ۱۶ نومبر ۲۰۲۲ء | بسم اللہ الرحمن الرحیم | جلد نمبر: ۱۵ ۔ شمارہ نمبر: ۲۱۔۲۲

پندرہ روزہ

معارف فیچر کراچی

MA'ARIF FEATURE

مدیر: سیّد شاہد ہاشمی

نائب مدیران: منعم ظفر خان، سید سمیع اللہ حسینی، نوید نون ۔ معاون مدیران: غیاث الدین، محمد عمید فاروقی

ڈی ۔ ۳۵، بلاک ۔ ۵، فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی ۔ ۷۵۹۵۰

فون: ۳۶۸۰۹۲۰۱۔۳۶۳۴۹۸۴۰(۲۱۔۹۲)، فیکس: ۳۶۳۶۱۰۴۰

برقی پتا: irak.pk@gmail.com، ویب گاہ: www.irak.pk

۱ ۔ **معارف فیچر** ہر ماہ کی یکم اور سولہ تاریخوں کو شائع کیا جاتا ہے۔ اس میں دنیا بھر سے (ہمیں) دستیاب ایسی معلومات کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے، جو اسلام سے دلچسپی اور ملت اسلامیہ کا درد رکھنے والوں کے غور و فکر کے لیے اہم یا مفید ہو سکتی ہیں۔

۲ ۔ پیش کیا جانے والا لوازمہ بالعموم بلا تبصرہ شائع کیا جاتا ہے۔ کسی مضمون، نقطۂ نظر، خیال یا معلومات کے انتخاب کی وجہ اس سے ہمارا اتفاق نہیں، اس کی اہمیت ہوتی ہے۔ کسی مضمون یا معلومات کی مدلل تردید یا اس سے اختلاف پر مبنی لوازمہ کو بھی جگہ دی جا سکتی ہے۔

۳ ۔ **معارف فیچر** کو بہتر بنانے کے لیے مفید معلومات کے حصول یا ان کے ذرائع تک رسائی میں آپ کی مدد کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

۴ ۔ ہمارے فراہم کردہ لوازمے کے مزید، لیکن غیر تجارتی ابلاغ کی عام اجازت ہے۔

۵ ۔ **معارف فیچر** کی کوئی قیمت مقرر نہیں۔ تاہم عطیات کی ضرورت بھی رہتی ہے اور عطیات قبول بھی کیے جاتے ہیں۔ **اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی**

یورپ: سبز توانائی کا منصوبہ، سردی اور یوکرین جنگ

Jonathan Fenton-Harvey

یورپ روس کی گیس پر سے اپنا انحصار ختم کرنے کے لیے توانائی کے نئے ذرائع ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا ہے، توانائی پر انحصار کی وجہ سے یورپ کی کمزوری اور منصوبے واضح نظر آ رہے ہیں، اس کے علاوہ مختلف مسائل نے یورپ کو بُری طرح ہلا دیا ہے جس کی وجہ سے سبز توانائی کی جانب یورپ کی منتقلی کی امیدیں کمزور پڑ گئیں ہیں۔

روس یورپ کو دی جانے والی ۸۰ فیصد سے زیادہ گیس کی فراہمی بند کر چکا ہے، جب کہ یورپ ۲۰۲۷ء تک روس کے فوسل ایندھن کو بند کرنے کا ارادہ رکھتا تھا، یورپی ممالک سبز توانائی کے منصوبے کو خطرے میں ڈالے بغیر قلیل المدتی متبادل ڈھونڈنے کی سر توڑ کوشش کر رہے ہیں۔

یورپ سبز توانائی کا ایک ایسا ذریعہ ڈھونڈ رہا ہے جس میں کاربن صفر ہو اور وہ سبز توانائی حاصل کر سکیں، جس کے لیے یورپ نے ۳۰۰ ملین یورو مختص کیے ہیں، یورپ کے فریم ورک کا مقصد گیس کے اخراج کو ۴۶ فیصد تک کم کرنا ہے جیسا کہ ۱۹۹۰ء میں تھا، یہ منصوبہ ۲۰۵۰ء تک کاربن کی غیر موجودگی کو برقرار رکھنے میں مدد کرے گا۔

اس منصوبہ پر اگرچہ کچھ تنقید کی جا رہی ہے لیکن اس سے بڑا مسئلہ یوکرین کا ہے، یہ مسئلہ یورپ کے اہداف پر ایک گھومتی ہوئی بال کی طرح آ کر لگا ہے، یورپی ممالک اس وقت گیس کی برآمدات کے منصوبوں پر اتفاق کرنے کی جدو جہد کر رہے ہیں۔

معاشی خدشات

گیس اور تیل کی بڑھتی ہوئی قیمتوں کے ساتھ ساتھ یورو زون میں مہنگائی آسمان کو چھونے لگی ہے، مہنگائی کی وجہ سے مستقبل میں معاشی خدشات بڑھ رہے ہیں، آئی ایم ایف کی پیش گوئی کے مطابق ۲۰۲۳ء میں یورپ کی معیشت صرف ۰٫۷ فیصد بڑھے گی جبکہ ابھرتی ہوئی معیشتوں کا معاشی گراف ۴٫۱ فیصد تک جائے گا، سوائے ترکی کے جس کی معیشت ۳ فیصد تک بڑھنے کی امید موجود ہے۔

براعظم میں پھیلے ہوئے صارفین کے علاوہ یورپ کے شہری سردیوں میں گیس کی بہت زیادہ قیمت ادا کریں گے کیونکہ سردیوں میں گھر کو گرم رکھنے کے لیے گیس کی ضرورت ہوتی ہے، ۱۴ اکتوبر کو یورپ کرائسس مینجمنٹ کمشنر جینز لینارسس نے خبردار کیا ہے کہ پورے یورپ میں بلیک آؤٹ کا امکان ہے، جب کہ دیگر ممالک خصوصاً جرمنی بدترین صورتحال کی تیاری کر رہے ہیں۔

توانائی کے بحران پر یورپ کے ردِّعمل نے آپس کی شدید تقسیم کو واضح کر دیا ہے، جیسے کہ سرکردہ رکن ممالک جرمنی اور فرانس قیمتوں پر اتفاق نہیں کر پائے، حتیٰ کے غریب یورپی ممالک ہنگری اور بلغاریہ نے یہ کہا ہے کہ وہ روس کی توانائی کی جگہ کسی دوسری جگہ سے خریداری پر آنے والی قیمت کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتے۔

ان مسائل کا واحد حل قیمتوں کی حد مقرر کرنا قرار دیا گیا ہے، یہ یورپ کے بنیادی معاشی مسائل کا طویل المدتی حل نہیں تلاش کر سکیں گے، یہ محض کچھ وقت کے لیے یورپ کے اقتصادی تناؤ کو کم کر سکیں گے۔ یورپی ممالک نے ضرورت کے تحت گھرانوں کو چھوٹی مقدار میں سبسڈی دی ہے لیکن یہ براعظم کے صارفین کے لیے عارضی امداد ہے۔

بڑا مسئلہ

کچھ دوسرے مسئلوں کی وجہ سے یورپ میں معاشی بحران شدت اختیار کر گیا ہے، یورپ کے پاس دوسرے ذرائع سے گیس نکالنے کے طریقے موجود ہیں لیکن وہاں پر نقل و حرکت کے لیے بنیادی ڈھانچے کی کمی ہے البتہ اس پر بات چیت شروع ہو چکی ہے۔ پائپ لائن نہیں ڈالی گئی اور یہ مسلسل طویل مدت سے نظر انداز ہو رہا ہے یہاں تک کہ امریکا میں جہاں قدرتی گیس پائی جاتی ہے وہ بھی یورپ کی طلب پوری کرنے کے لیے قدرتی گیس کی نقل و حرکت کے لیے بنیادی ڈھانچے سے محروم ہیں۔

بہرحال یورپ نے ری گیسی فیکیشن کے بنیادی ڈھانچے کی کمی کو دور کرنے کی جدو جہد کی ہے، جب کہ بحیرۂ روم میں امریکا کے مائع قدرتی گیس کے ۶ ٹینکر تیر رہے ہیں اور یورپ نے نئی سپلائی کو اپنانے کی بھی کوشش کی ہے۔

اندرونی صفحات پر

- ٹرمپ کا ''چراغ'' جلتا رہے گا؟
- امریکی وسط مدتی انتخابات، ٹرمپ کو شکست
- ایلون مسک کا ''ٹوئٹر'' کیسا ہوگا؟
- تنوّع پر برطانیہ کو ناز، ہندوستان گریزاں کیوں؟
- ایران میں پنپتی مزاحمتی تحریک
- چینی کمیونسٹ پارٹی کانگریس اور مغرب کے خدشات
- پاکستان 'ایک فیصد لوگوں کا ملک'
- بھارت کو سب جائز ہے!

Fortnightly "Maarif Feature" Karachi: REG.No.SC-1303

دوسری طرف اکتوبر کے آخری ہفتے میں گیس کی سپلائی یورپ میں کم ہوئی ہیں، یہ ۱۰۰ر یورو میگا واٹ فی گھنٹہ کے حساب سے کم ہوئیں اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سپلائی کا مسئلہ ہی اصل مسئلہ ہے۔

فوسل کا ایندھن معاشی ترقی اور اس کے استحکام کے لیے بہت ضروری ہے اور یہ بنیادی سامان جیسے پلاسٹک، الیکٹرانکس، دواؤں اور سنتھیٹک فیبرک میں استعمال ہوتا ہے، اسی لیے اس کی سپلائی جب متاثر ہوتی ہے تو ان چیزوں کی قیمتوں میں اضافہ ہوجاتا ہے۔

گھریلو گیس کے بحران سے ہٹ کر اگر دیکھا جائے تو یورپ ان صنعتوں میں بحران کا سامنا کررہا ہے جو گیس پر انحصار کرتی ہیں خاص کر فارما سوٹیکل، کیمیکل انڈسٹری، آٹوموٹو سیکٹر اور درستی سامان کی تیاریوں کی صنعتیں، ان میں اکثر زیادہ توانائی اور زیادہ خام مال پر انحصار کرتی ہیں۔ انڈسٹری میں گیس کا بحران مزید ایک بڑا اور پیچیدہ مسئلہ ہے، یورپ کو یہ طے کرنا ہوگا کہ وہ گھرانوں کو گیس کی فراہمی دے یا انڈسٹریز کے انتظام کو بہتر بنائے۔

یورپ میں کچھ بڑی فیکٹریاں جرمنی اور فرانس کی بڑی فیکٹریوں کی طرح پیداوار میں کمی کرنے کے لیے مجبور ہیں اور اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اگر بحران تیز ہوا تو پیداوار میں کمی ہوگی۔

سبز توانائی کا منصوبہ

یورپ کی حالیہ معاشی کمزوری کی وجہ اس کا سبز توانائی منصوبہ ہے، اس منصوبے کے مطابق سال ۲۰۳۰ء تک خام تیل اور قدرتی گیس کا استعمال کافی حد تک ختم ہوجانے کی توقع ہے، شمسی پینل اور ونڈ ٹربائن جیسے مزید پائیدار توانائی کے ذرائع ان کی جگہ لے لیں گے۔

اس حقیقت کے علاوہ کہ قابل تجدید توانائی کی کئی معدنیات (نکل، ایلمونیم اور تانبا) روس سے آتے ہیں، یورپ کے جوہری توانائی اور حیاتیاتی ایندھن کا استعمال ترک کرنے کے فیصلے نے اسے کمزور کر دیا ہے۔ ۲۰۲۰ء میں یورپ نے پورے خطے کی ۲۴ فیصد بجلی ایٹمی پلانٹس سے پیدا کی مگر ۲۰۰۶ء سے ۲۰۲۰ء تک ایٹمس کی تقسیم سے یورپ کی بجلی کی پیداوار ۲۵ فیصد کم ہوگئی۔ جوہری توانائی کو ترک کرنے کے فیصلے نے یورپ کی معیشت کو روس اور یوکرین کی جنگ سے آنے والے قیمتوں کے جھٹکے کے لیے بے دست و پا چھوڑ دیا ہے۔

یورپ نے بھی وقتی طور پر توانائی کے بحران کو ختم کرنے کے لیے دوبارہ حیاتیاتی ایندھن کا سہارا لیا ہے۔ بین الاقوامی توانائی کی ایجنسی (IEA) کی پیش گوئی کے مطابق یورپ کی LNG درآمدات میں اس سال ۶۰ کھرب کیوبک میٹر (bcm) اضافہ ہوگا۔

یورپ نے توانائی کی قلت کو ختم کرنے کے لیے دوسرے ملکوں کی مدد طلب کی ہے۔ جیسے کہ اسپین اور اٹلی کا الجیریا کے ساتھ معاہدہ کرنا اور جرمنی کا ابوظہبی کی قومی تیل کمپنی کے ساتھ ۲۵ ستمبر کو ایک لاکھ ۳۷ ہزار کیوبک میٹر LNG درآمد کرنے کا معاہدہ، کیا یورپ اور گلف کو پریشن کونسل کے درمیان مزید معاہدے ہونے کا امکان ہے۔

اگرچہ الجیریا بھی گیس کی فراہمی میں مدد کرسکتا ہے لیکن یورپ میں گھرانوں کو گیس کی فراہمی کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے بنیادی ڈھانچہ موجود نہیں ہے، گلف کو پریشن کونسل سے جوڑنے والے بنیادی ڈھانچہ کی بھی کمی ہے اور یہی مسئلہ سستی گیس کی فراہمی میں ایک بڑی رکاوٹ ہے۔

جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں کہ توانائی کی قیمتیں کم رکھنے کے لیے سپلائی برقرار رکھنا اہم ہے اور خطہ سے جوہری توانائی کے خاتمے نے یورپ کو کمزور کر دیا ہے حتیٰ کہ فرانس جس کا بجلی کے لیے جوہری توانائی پر ۷۰ فیصد انحصار ہے، اب بھی قدرتی گیس کی قیمتوں کے مطابق بجلی کی قیمت کا تعین کرتا ہے۔ اس کے باوجود فرانس کی مہنگائی ۶ء۲ فیصد کی شرح پر یورپ کے ممالک کے درمیان تھوڑی کم ہے بمقابل اس سے بڑے یوروزون کی ۹ء۹ شرح کے۔

یورپ کے اندر اختلافات کے باوجود جولائی ۲۰۲۲ء میں جوہری توانائی کو قابلِ تجدید توانائی کے طور پر نامزد کیا گیا حالانکہ کے اس سے پہلے نیوکلیئر فضلے کے انتظام پر تحفظات موجود تھے، اگرچہ یورپ ایٹمی توانائی کو ایک مقررہ حد تک بنانے کا فیصلہ کر چکا ہے جیسا کہ ایٹمی فضلے کے لیے قابل برداشت ذخیرے کی جگہ تلاش کرنا، اور یہی چیز یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ یورپ کی معیشت کے استحکام کے لیے یہ ضروری ہے۔

یہاں تک کہ ایٹمی توانائی کے موضوع نے یورپی ریاستوں کو ایک بار پھر تقسیم کر دیا ہے، فرانس، ہنگری اور نیدرلینڈ نیوکلیئر توانائی کے حق میں ہیں، جب کہ آسٹریا اور لکسمبرگ اس کے مخالف ہیں۔ بیلجیم اور جرمنی غیر یقینی صورتحال کا شکار ہیں، ان تمام چیزوں کو مدنظر رکھتے ہوئے جرمنی نے اپریل ۲۰۲۲ء تک ایٹمی یونٹ بند کرنے کا منصوبہ بنایا تھا لیکن اپریل ۲۰۲۳ء تک وہ اپنے کم سے کم ۳ یونٹ کھلے رکھے گا۔

یورپ توانائی کے بحران میں بُری طرح پھنسا ہوا ہے وہ اس کے حل تک نہیں پہنچ پا رہا، یورپ یہ نہیں سمجھ پا رہا کہ اس بحران کے خاتمے کے لیے اس کی ترجیحات کیا ہوں گی۔ کتنا معاشی دباؤ یورپ برداشت کرسکتا ہے کہ وہ اگلی صدی میں سبز توانائی کا منصوبہ برقرار رکھ پائے اور یورپ اتنی طاقت حاصل کر سکے کہ وہ فوسل ایندھن سے دور جانے کو یقینی بنا سکے، بہت ممکن ہے کہ یورپ کو اپنے سبز توانائی کے منصوبے پر نظرثانی کرنی پڑے۔ (ترجمہ: سمیہ اختر)

"Can EU's green energy plan survive the harsh winter and Ukraine war?"
("trtworld.com". October 26, 2022)

بقیہ: تنوّع پر برطانیہ کو ناز، ہندوستان گریزاں کیوں؟

انتخابات کے وسط میں اپنی ایک تقریر میں انہوں نے وائناڈ، جہاں اقلیت زیادہ ہیں، سے انتخاب لڑنے کے لیے راہول گاندھی کا مذاق اڑایا۔

یوگی آدتیہ ناتھ جیسے دیگر بی جے پی لیڈر اپنی تقریروں میں اس سے کہیں زیادہ بیہودہ زبان استعمال کرتے ہیں، جیسا کہ مودی اپنے وزیراعلیٰ کے دور کے ابتدائی دنوں میں کیا کرتے تھے۔ لیکن ایک بڑی تصویر یہ ہے کہ ہندوستان کی اقلیتیں، بالخصوص مسلمان ہر محاذ سے ہورہے حملوں کے بیچ خود کو گھرا ہوا پاتا ہے- ہندوستان کے ساتھ ان کے رشتے پر اسی طرح سے حملہ کیا جاتا ہے، جس طرح برطانیہ میں کئی دہائیوں تک نسل پرستوں نے سیاہ فام اور ایشیائی لوگوں پر کیا۔

شہروں، محلوں، ٹرینوں کے مسلمان لگنے والے ناموں کو بدلا جارہا ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کو نیچا دکھانے یا خاموش کرنے کے لیے اسکول کی نصابی کتابوں میں تبدیلی کی جارہی ہے۔ غیر قانونی کام کرنے کے الزام میں کسی بھی مسلمان کے گھر، عدالت میں کسی بھی سماعت سے قبل سزا کے طور پر گرائے جا رہے ہیں اور عدالت اس پر کوئی نوٹس لینا ضروری نہیں سمجھتی۔

ہندوستان کے اعلیٰ عہدے پر فائز ہونے کا خواب دیکھنے کی جگہ، مسلمان ہر جگہ روپوش رہنے میں ہی حکمت دیکھتے ہیں۔ تنوّع کی علامتوں کا پوشیدہ رہنا ہی سب سے اچھا سمجھا جاتا ہے ورنہ انہیں سزا ہوسکتی ہے۔ یہ جدید ہندوستان کی کریہہ سچائی ہے اور جتنی جلدی ہم اس کو سمجھ لیں اور اسے بدلنے کے لیے کام شروع کریں اتنا ہی بہتر ہوگا۔

"As the UK embraces its diversity, Indians need to ask why India is turning its back on its own".
("thewire.in". October 31, 2022)

ٹرمپ کا ''چراغ'' جلتا رہے گا؟

Jelani Cobb

دسمبر ۱۹۵۴ء میں امریکی سینیٹ کا اجلاس ریاست وسکونسن سے تعلق رکھنے والے جونیئر سینیٹر جوزف مکارتھی کے محاسبے کے لیے منعقد ہوا۔ اس کے بعد کے چند ماہ کے دوران جوزف مکارتھی کو، جس نے اشتراکیت کے پھیلاؤ کا ڈراوا دکھا کر کامیابی حاصل کی تھی، غیر معمولی مالی گراوٹ کا سامنا کرنا پڑا۔ اسے قومی ٹی وی پر پیش کی جانے والی آرمی بنام مکارتھی سماعتوں اور صحافی ایڈورڈ آر مرو کی طرف سے شدید نکتہ چینی کے باعث انتہائی نوعیت کے دباؤ کا بھی سامنا تھا۔ ایک وقت تھا کہ جوزف مکارتھی منہ پھٹ اور سرکش تھا۔ وہ کسی کو خاطر میں نہ لاتا تھا اور کسی کو کچھ بھی کہہ دیتا تھا۔ لوگ اس سے بات کرتے ہوئے ڈرتے تھے مگر پھر ایسا وقت بھی آیا جب اُس کی یہی ''خوبیاں'' اُسے لے ڈوبیں۔ جس سے سب ڈرتے تھے اُس سے اب کوئی بھی ڈرنے والا نہ رہا۔ عام طور پر یہ کہا جاتا تھا کہ مکارتھی کے زوال میں اُس کے طریقِ کار نے کلیدی کردار ادا کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سے ہٹ کر بھی کچھ تھا، جو اس کے خلاف گیا۔ وہ اپنی پوزیشن مضبوط رکھنے کے لیے بہت سے دعوے کرتا تھا۔ اس کا ایک دعویٰ یہ بھی تھا کہ امریکی سینیٹ نے ڈھائی سو اشتراکیوں کو ملازمت دی ہے اور یہ کہ اُس کے پاس ان تمام افراد کے ناموں کی فہرست بھی ہے۔ مکارتھی کا تعلق ری پبلکن پارٹی سے تھا جبکہ تب امریکی کانگریس کے دونوں ایوان (ایوانِ نمائندگان اور سینیٹ) ڈیموکریٹک پارٹی کی مٹھی میں تھے۔ اور صدر بھی اِسی پارٹی کا تھا۔

۱۹۵۴ء میں جب آرمی بنام مکارتھی سماعتوں کا آغاز ہوا تب کانگریس کے دونوں ایوانوں پر ری پبلکن کا راج تھا اور ایوانِ صدر میں بھی آئزن ہاور کی شکل میں ری پبلکن صدر تھا۔ ڈیموکریٹک پارٹی کے خلاف جانا اور اُسے بدنام کرنے کی سازش کرنا الگ معاملہ تھا، جبکہ اپنے فکر و عمل سے اپنی ہی جماعت کو شدید نقصان پہنچانا بالکل مختلف معاملہ تھا۔ آخر میں یہ ہوا کہ ۲۲ سینیٹروں نے بھی جوزف مکارتھی کے محاسبے اور مواخذے کے حق میں ووٹ دیا۔

سابق امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ نے جب صدارتی امیدوار کی حیثیت سے سیاست میں بڑا قدم رکھا تھا، تب سے لوگ ان کا موازنہ جوزف مکارتھی سے کرتے آئے ہیں۔ اس کا سبب صرف یہ نہیں تھا کہ وہ اپنے مزاج کے حوالے سے مکارتھی سے بہت ملتے جلتے تھے بلکہ اس لیے بھی کہ مکارتھی کی طرح ٹرمپ نے بھی اپنے مذموم مقاصد اور ارادوں کے لیے میڈیا کو بالکل اُسی طرح استعمال کیا، جس طرح مکارتھی نے استعمال کیا تھا۔

امریکا میں حال ہی میں وسط مدتی انتخابات ہوئے ہیں۔ انتخابی نتائج نے ٹرمپ اور مکارتھی میں مماثلت کا ایک میدان اور بڑھا دیا۔ یہ میدان ہے سیاسی زوال کے حوالے سے بیانیے کا۔ گرینڈ اولڈ پارٹی (ری پبلکن پارٹی) نے اب تک ٹرمپ کے کرپٹ، بددیانت، غیر جمہوری، بہت حد تک غیر قانونی رویے اور سب سے بڑھ کر کانگریس پر سیاسی کارکنوں کے باضابطہ حملے کی قیادت جیسے انتہائی مذموم اور سنگین معاملات کا دفاع کیا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ جو کچھ ٹرمپ نے کیا وہ بالکل درست تھا مگر اب ایسا لگتا ہے کہ ری پبلکن کو جو نقصان مکارتھی نے پہنچایا تھا کچھ کچھ ویسا ہی نقصان ٹرمپ نے بھی ری پبلکن کو پہنچا ہی دیا ہے۔ سبھی برملا کہنے لگے ہیں کہ ٹرمپ اپنی جماعت کے واجبات میں سرِفہرست ہیں۔ وسط مدتی انتخابات کے نتائج سے ٹرمپ بہت جُز بُز ہوئے ہیں۔ یہ بات قابلِ غور ہے کیونکہ وہ شدید اشتعال کی حالت میں ایسا کچھ بھی کر سکتے ہیں جو اُن کی پارٹی کو مزید نقصان پہنچائے۔ جنوری ۲۰۲۱ء میں ایوانِ صدر سے نکالے جانے کے بعد سے اب تک ٹرمپ نے ایسا بہت کچھ کیا ہے، جس نے اُن کے ناقدین کو کھل کر بولنے کا موقع فراہم کیا ہے۔ رہی سہی کسر وسط مدتی انتخابات کے نتائج نے پوری کر دی ہے۔ ایوانِ نمائندگان میں ری پبلکن نمائندوں کو توقع سے کہیں کم کامیابی ملی ہے اور سینیٹ تو اس وقت ہے ہی ڈیموکریٹس کے ہاتھوں میں۔ ڈیموکریٹس اب کانگریس کے دونوں ایوانوں میں انتہائی مضبوط ہیں اور دوسری طرف ری پبلکن کی پوزیشن کمزور پڑتی جارہی ہے۔ ایسے میں صاف محسوس کیا جاسکتا ہے کہ ۲۰۲۴ء کے صدارتی انتخاب میں ری پبلکن کی کارکردگی کچھ خاص نہیں رہے گی اور ری پبلکن امیدوار کو ممکنہ طور پر ناکامی ہی کا منہ دیکھنا پڑے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ ری پبلکن اب ڈونلڈ ٹرمپ کے برانڈ سے خود کو دور کرتے جارہے ہیں۔ حد یہ ہے کہ رپورٹ مرزوک کی ملکیت والے میڈیا ہاؤسز سے بھی ٹرمپ کے لیے ناقدانہ آوازیں ابھرنے لگی ہیں۔ یہ سب کچھ اس طور ہو رہا ہے کہ کچھ بھی چھپا ہوا نہیں۔ اب یہ واضح طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے کہ ری پبلکن ٹرمپ اور اُن کے حامی گروپ کو اچانک مکمل طور پر خیر باد کہنے میں کچھ زیادہ دقت محسوس کریں گے نہ افسوس۔ ٹرمپ اور اُن کے پورے ٹولے سے فاصلہ رکھنے پر خاص توجہ دی جارہی ہے۔ ایک آدمی نے پوری پارٹی کی ساکھ داؤ پر لگادی ہے۔ ویسے تو خیر اور بھی بہت کچھ ہوا ہے جس نے امریکی سیاست کو شدید نقصان پہنچایا ہے مگر جو کچھ ٹرمپ نے کیا ہے وہ کسی نے نہیں کیا۔ بش سینیئر اور بش جونیئر نے بھی اپنی طرزِ سیاست سے امریکا کے لیے پوری دنیا میں مشکلات پیدا کیں مگر پھر بھی اُنہوں نے کچھ ایسا بھی کیا جو ملک کے لیے تھوڑی بہت گنجائش پیدا کرنے والا تھا۔ ٹرمپ کا معاملہ یہ رہا ہے کہ اُس نے ملک کے بیشتر اہم اندرونی اور بیرونی معاملات کو شدید خرابی سے دوچار کیا اور معاملات کی درستی یقینی بنانے کے حوالے سے کچھ بھی نہیں کیا۔ ٹرمپ کو ری پبلکن پارٹی کی سیاست سے بالکل الگ کرنے کا معاملہ اب کچھ زیادہ دور کا نہیں لگتا۔ اور اس پر امریکا میں کسی کو حیرت بھی نہیں ہونی چاہیے کیونکہ جو کچھ ٹرمپ اور ان کے ٹولے نے کیا ہے وہ فی الواقع اتنا خطرناک رہا ہے کہ ایک طرف تو امریکی سیاست میں ری پبلکن پارٹی کے مشکلات بہت بڑھی ہیں اور دوسری طرف اقوامِ عالم کی برادری میں امریکی مفادات کو شدید خطرات لاحق ہوئے ہیں۔

ٹرمپ نے سات سال قبل امریکی صدر کے منصب کے لیے امیدوار ہونے کا اعلان کیا تھا۔ وہ صدر منتخب ہوئے اور پھر صدارتی انتخاب ہار بھی گئے۔ اب وہ پھر صدارتی امیدوار ہوں گے۔ اب تک صرف آئزن ہاور اور یولیسز سیاسی تجربے کے نہ ہونے پر بھی کامیاب ہو پائے تھے۔ ٹرمپ اب ان کی صف میں ہیں۔ سات سال ٹرمپ نے جو ماحول پیدا کیا تھا وہ اب دم توڑ چکا ہے۔ تب ری پبلکن پارٹی کی قیادت خاصی کمزور تھی۔ اب ایسا نہیں ہے۔ اب تک صرف ایک بار ایسا ہوا ہے کہ کوئی امریکی صدر اپنے منصب کا دفاع کرنے میں ناکامی کے بعد بھی دوسری مدت کے لیے صدر منتخب ہوا ہو۔ یہ اعزاز ۱۸۹۲ء میں ڈیموکریٹ گروور کلیولینڈ کے حصے میں آیا تھا۔ انہوں نے بینجمن ہیریسن کو ہرایا تھا۔ یہ شکست اس لیے

ہوئی تھی کہ ہیریسن نے ری پبلکن کی صفوں میں انتشار پیدا کر دیا تھا۔ ۲۰۱۶ء میں ٹرمپ نے پرائمریز میں ممکنہ ری پبلکن صدارتی امیدواروں کو خاصے موثر انداز سے خاموش کر دیا تھا۔ ٹرمپ جس طور صدارتی امیدوار منتخب ہوئے تھے وہ بھی خاصا متنازع تھا۔ فلوریڈا کے گورنر ران ڈیسینٹز کے معاملے میں سب کچھ درست نہیں تھا۔ ٹرمپ نے امریکی سیاسی تاریخ میں منفرد سمجھی جانے والی گڑبڑ پیدا کی۔ جو کچھ ٹرمپ نے کیا اُسے سیاسی تجزیہ کاروں نے ٹرمپ ازم کا نام دینے میں دیر نہیں لگائی۔ انہوں نے کانگریس پر حملے کے حوالے سے جو گھناؤنا کردار ادا کیا، اُس نے امریکا میں جمہوریت کے لیے سوچنے والوں کو پریشان کر دیا۔ کیا امریکی جمہوریت اب تشدد کی نذر ہو جائے گی؟ یہ سوال سبھی کے ذہنوں میں گردش کرنے لگا۔ سب سوچنے لگے کہ کب اب امریکا میں سیاسی معاملات صرف تشدد کے ذریعے طے کیے جائیں گے۔ ٹرمپ ازم نے امریکی سیاسی روایات کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا ہے۔ ری پبلکن کی رجعت پسندی اور انتہا پسندی کے بارے میں کسی کو کچھ شک نہ تھا مگر معاملات تشدد تک پہنچیں گے یہ تو کسی نے بھی نہ سوچا تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ٹرمپ نے کاروباری دنیا میں بہت نام کمایا ہے۔ انہوں نے سیاست میں بھی اپنے آپ کو منوانے کے لیے وہ سب کچھ کیا، جو انہوں نے کاروبار کی دنیا میں کیا تھا۔ وہ کاروبار کی دنیا میں اس لیے کامیاب نہیں ہوئے تھے کہ وہ تنظیمی قیادت کے ہنر سے واقف ہیں یا کوئی منفرد آئیڈیا تیزی سے پھیلا سکتے ہیں۔ اُن کا اصل ہنر صرف اور صرف مارکیٹنگ ہے۔ وہ ملک کے پہلے سیاہ فام صدر کے عہد میں سیاسی افق پر ابھرے اور سفید فام امریکیوں کو خوفزدہ کرنے میں کامیاب رہے۔ انہوں نے سفید فام امریکیوں کی بالادستی کو لاحق خطرات کو بہت بڑھا چڑھا کر پیش کرنے میں بھی کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ امریکا بھر میں سفید فام آبادی مستقبل کے حوالے سے خوفزدہ ہے۔ براک اوباما کے حوالے سے انہوں نے سفید فام امریکیوں کو ڈرایا کہ کل کو اُن کے لیے سیاست میں کچھ بھی نہ بچے گا۔ یہ حکمتِ عملی کام کر گئی۔ مارکیٹنگ میں بھی تو اِسی نوعیت کی ذہنیت کام کرتی ہے۔ انہوں نے براک اوباما کی پیدائش کے سرٹیفکیٹ کے بارے میں بھی خوب جھوٹ بولا۔ انہوں نے عوام کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ براک اوباما کے بارے میں تحقیقات کی جارہی ہے اور جو کچھ سامنے آرہا ہے اُس پر کسی کو یقین نہیں آرہا! ٹرمپ جھوٹ بولتے گئے اور لوگ یقین کرتے گئے۔

اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ براک اوباما کی پیدائش کے حوالے سے پایا جانے والا قضیہ ٹرمپ نے پیدا نہیں کیا۔ وہ تو صرف پہلے سے موجود جھوٹ کو بہت بڑھا چڑھا کر پیش کرتے گئے اور اپنا اُلو سیدھا کرنے کی کوشش میں بہت حد تک کامیاب رہے۔ سوال یہ تھا کہ سفید فام امریکیوں کو خوفزدہ کیا جاسکتا ہے یا نہیں۔ ٹرمپ نے ثابت کیا کہ جھوٹ کو ڈھنگ سے بولا جائے اور معاملات کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا جائے تو ایسا کیا جاسکتا ہے۔ سفید فام امریکیوں میں غیر سفید فام امریکیوں کے حوالے سے خوف تو پایا ہی جاتا ہے۔ ایسے میں ضرورت اس بات کی تھی کہ جارحانہ مارکیٹنگ کے ذریعے اس خوف سے خوب فائدہ اٹھایا جائے۔ مکارتھی نے بھی عوام میں پائے جانے والے خوف ہی کو بہت عمدگی سے اپنے حق میں استعمال کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ بہت حد تک کامیاب بھی رہے تھے۔ وہ عوام کو مختلف حوالوں سے خوف اور شکوک میں مبتلا کرکے ہی ۱۹۴۶ء میں سینیٹ تک پہنچے تھے۔ مکارتھی چاہتے تھے کہ لوگوں میں پائے جانے والے خوف کا بھرپور فائدہ اٹھایا جائے اور وہ اٹھایا گیا۔

جوزف مکارتھی نے اشتراکیت کے حوالے سے ہوّا کھڑا کرکے ایسا ماحول پیدا کیا جس میں قوم اشتراکیوں کا نام بھی سننا پسند نہیں کرتی تھی۔ امریکا میں اشتراکیت کی بات کرنے والوں کو انتہائی شک کے ساتھ ساتھ نفرت کی نظر سے بھی دیکھا جانے لگا۔ ایسے امریکی بھی تھے اور خاصی بڑی تعداد میں تھے جو سمجھتے تھے کہ اشتراکیت کی تبلیغ ملک دشمنی کے مترادف ہے۔ اشتراکیوں کو غدار گردانا جانے لگا۔ اشتراکیت کے خلاف امریکا میں خاصی تُند فضا پیدا کردی گئی مگر یہ نظریہ مکارتھی اور اس کے ہم خیال لوگوں کے ہتھکنڈے کو سہہ گیا۔ امریکی سپریم کورٹ نے ۱۹۵۷ء اور ۱۹۵۸ء میں چند اہم فیصلوں کے ذریعے وہ تمام اقدامات غلط قرار دیے جو اسمتھ ایکٹ کے تحت اشتراکیوں کے خلاف کیے گئے تھے۔ یہ تمام اقدامات صرف اور صرف حب الوطنی کے نام پر کیے گئے تھے۔ اشتراکیوں کے خلاف ایسی فضا تیار کردی گئی تھی کہ کوئی بھی اُن کے حق میں کچھ بولتے ہوئے ڈرتا تھا کہ کہیں اُسے بھی غدار اور وطن دشمن قرار نہ دے دیا جائے۔ تب بھی ری پبلکن نے شدید عدم رواداری کا مظاہرہ کیا۔ ری پبلکن پارٹی میں غیر جمہوری مزاج کو پروان چڑھنے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔

خیر، ٹرمپ نے جو نقصان پہنچایا وہ بہت حد تک برقرار ہے۔ امریکا میں تارکین وطن ۱۴ فیصد تک ہیں۔ سفید فام امریکیوں میں یہ خوف تو بہت پہلے سے موجود ہے کہ کہیں اُن کی فیصلہ کن برتری ختم نہ ہو جائے اور دوسری نسلیں اُن پر حاوی نہ ہو جائیں۔ اب یہ خوف مزید پنپ چکا ہے۔ ٹرمپ نے اپنا کام کر دکھایا ہے۔ عام سفید فام امریکی اب مستقبل کے حوالے سے مستقل خوف میں مبتلا ہے۔ ری پبلکن پارٹی نے ہمیشہ اِسی نوعیت کی سیاست کی ہے۔ کبھی سہانے خواب دکھائے ہیں، کبھی ڈرایا ہے۔ اس حوالے سے ڈیموکریٹس کو بہت محتاط ہوکر چلنا ہوگا۔ بے احتیاطی سے ٹرمپ ازم مزید پروان چڑھ سکتا ہے۔ ری پبلکن پارٹی کی سیاست جن بنیادوں پر کھڑی ہے وہ ڈیموکریٹک پارٹی کے اقدامات سے مزید مستحکم ہوسکتی ہیں۔ ٹرمپ کے خلاف جانے میں بے احتیاطی سے ڈیموکریٹس ٹرمپ ازم کو مضبوط تر کرنے کا ذریعہ ثابت ہوسکتے ہیں۔ (ترجمہ: محمد ابراہیم خان)

"The enduring power of Trumpism".
("The New Yorker". November 15, 2022)

بقیہ: پاکستان ’ایک فیصد لوگوں کا ملک‘

جو اپنی پانچویں سالگرہ سے قبل موت کے خطرے سے سب سے زیادہ دوچار ہیں۔ یہ ہے ہماری حقیقت۔

اگر آپ سوشل کلبوں اور گالف کلبوں کے رکن ہیں تو آپ کے لیے پاکستان بہت اچھا ہے لیکن اگر آپ کوئی بھوک کے ستائے بچے ہیں، غریب ہاری ہیں، مدرسے کے طالب علم ہیں، روز کی دیہاڑی کمانے والے ایک والد ہیں یا دوسروں کے بچے پالنے والی آیا ہیں تو اس ملک میں آپ کو بہت مشکل ہوگی۔ پاکستان متوسط طبقے کے خاندانوں کے لیے نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ملک میں عدم اطمینان غالب رہتا ہے۔

یہاں کامیابی کی اصل بنیاد آپ کے والد کی حیثیت ہے، آپ کی ذہانت اور آپ کا کام کرنے کا طریقہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ ہاں کچھ لوگ اشرافیہ کا حصہ بننے میں کامیاب ہو جاتے ہیں لیکن وہ لوگ دراصل اس اصول کو ثابت ہی کرتے ہیں۔

اس پورے رجحان کی وجہ سے دولت ایک سے دوسری نسل تک منتقل ہوتی ہے اور دیگر لوگ اس میں شامل نہیں ہوتے۔ یہی چیز پاکستانی کو غریب رکھے ہوئے ہے اور یہی وجہ ہے کہ اشرافیہ میں دولت کے ارتکاز کو ختم کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر ہمیں بحیثیت قوم ترقی کرنی ہے تو ہمیں ایک نیا معاشرتی نظام تیار کرنا ہوگا۔

"The one per cent republic".
(Daily "Dawn" Karachi. November 10, 2022)

امریکی وسط مدتی انتخابات، ٹرمپ کو شکست

رافعہ ذکریا

تکنیکی طور پر دیکھا جائے تو امریکا کے وسط مدتی انتخابات کے بیلٹ پیپر پر ڈونلڈ ٹرمپ کا نام موجود نہیں تھا۔ اور ویسے بھی یہ صدارتی انتخابات نہیں تھے بلکہ ۲/ایوانوں یعنی ایوانِ نمائندگان اور امریکی سینیٹ کے انتخابات تھے۔

مگر اس کے باوجود ری پبلکن امیدواروں کو پارٹی ٹکٹ حاصل کرنے کے لیے ایک ٹرمپ ٹیسٹ سے گزرنا تھا اور اکثر صورتوں میں ٹرمپ صرف ان امیدواروں کی تائید کررہے تھے جو ان کی عظمت اور بڑائی کو تسلیم کرنے پر راضی تھے اور ٹرمپ کے اس دعوے کی بھی حمایت کرتے تھے کہ ۲۰۲۰ء کا صدارتی انتخاب ڈیموکریٹس نے چوری کیا ہے۔

بدقسمتی سے ری پبلکن جماعت کے مستقبل کے لیے ان امیدواروں کو ایسا کرنے کی سزا دی جائے گی جو 'میک امریکا گریٹ اگین' کا نعرہ لگاتے ہیں۔ جیسے جیسے گزشتہ منگل انتخابات کے ابتدائی نتائج آنا شروع ہوئے تو یہ واضح ہوتا گیا کہ پہلے سے ہی اپنی فتح کا اعلان کرنے والے ری پبلکن غلط تھے۔

بہرحال ان وسط مدتی انتخابات سے قبل ہونے والی تمام پیشگوئیوں میں ری پبلکن کو فاتح قرار دیا جارہا تھا۔ کچھ ری پبلکن کے مطابق تو اس کا مطلب کانگریس کے ساتھ ساتھ سینیٹ پر بھی تقریباً مکمل کنٹرول حاصل ہونا تھا۔

کانگریس کے لیے لگائے جانے والے تخمینے کے مطابق اکثریت کے لیے درکار ۲۱۸ نشستوں میں سے ۲۰ یا ۳۰ نشستیں ری پبلکن کے پاس جانے کا کہا جارہا تھا۔ اسی طرح ۱۰۰ نشستوں والی سینیٹ کے بارے میں کہا جارہا تھا کہ یہاں نشستوں کی تقسیم ۴۶ اور ۵۴ کی ہوجائے گی اور اکثریت ری پبلکن کے پاس ہوگی۔

گزشتہ انتخابات میں صدارت، کانگریس اور سینیٹ گنوانے کے بعد ری پبلکن کا خیال تھا کہ وہ صرف جیت نہیں رہے بلکہ بڑی جیت ان کا انتظار کررہی ہے۔ ان کی یہ امید جن سروے کے نتائج پر تھیں وہ زیادہ تر کنزرویٹو اداروں نے کیے تھے۔ ان سروے میں یہ بھی بتایا گیا کہ کئی دہائیوں بعد نیویارک اور واشنگٹن جیسی ڈیموکریٹک ریاستوں میں بھی سخت مقابلہ دیکھنے کو مل سکتا ہے۔

اگر ۲۰۱۶ء کے صدارتی انتخابات پر نظر ڈالی جائے تو اس وقت شاید ہی کسی پیشگوئی میں ٹرمپ کی جیت بتائی گئی تھی لیکن اس وقت ٹرمپ کے پوشیدہ ووٹروں نے ان کے حق میں ووٹ دیا۔ یہ وہ ووٹر تھے جو کبھی اس بات کا اقرار تو نہیں کریں گے مگر اب بھی ہر حال میں وہ ٹرمپ کو ہی ووٹ دیں گے۔

بہرحال انتخابات سے پہلے جتنی بھی پیشگوئیاں کی گئیں ان کا نتیجہ اب سامنے آچکا ہے۔ ڈیموکریٹس نے نہ صرف سینیٹ کا کنٹرول اپنے پاس رکھا بلکہ وہ ایوانِ نمائندگان میں بھی ری پبلکن کی جیت کو معمولی فرق تک محدود رکھنے میں کامیاب رہے ہیں۔

اگرچہ فلوریڈا کے گورنر رون ڈی سینٹیس نے اپنے ڈیموکریٹک حریف پر ایک بڑی کامیابی حاصل کی لیکن باقی امیدوار اس میں ناکام رہے۔ وہ لوگ جو طویل عرصے اور ٹرمپ دور سے پہلے کے چندری پبلکن میں شامل نہیں تھے وہ بھی پارٹی میں رہنے میں کامیاب ہوگئے اگرچہ ''میک امریکا گریٹ اگین'' کے حامیوں کی طرف سے ایسا کرنا تقریباً ناممکن بنادیا گیا تھا۔

جارجیا کے لوگوں نے ایک مرتبہ پھر ری پبلکن امیدوار برائن کیمپ کو گورنر منتخب کرلیا ہے۔ اگر سال ۲۰۲۰ء کی بات کریں تو تب جارجیا کے نتائج کی بنیاد پر ہی ڈیموکریٹ نے سینیٹ میں اکثریت حاصل کی تھی۔ برائن کیمپ وہ ری پبلکن فرد تھے جنہیں ۲۰۲۰ء میں ٹرمپ نے 'میل اِن' ووٹوں کو مسترد کرنے کے لیے دباؤ میں لینے کی کوشش کی تھی کیونکہ ان میں اکثریت ڈیموکریٹس کو ووٹ ڈالے گئے تھے، تاہم کیمپ نے ایسا کرنے سے انکار کردیا تھا۔ اس لیے ووٹر غصے میں تھے لہٰذا جہاں انہوں نے دیگر انتخابات میں ڈیموکریٹس کو ووٹ دیے وہیں گورنر کے لیے ری پبلکن امیدوار کیمپ کو ووٹ دے دیا۔

یہ رجحان 'اسپلٹ ٹکٹ ووٹنگ' کہلاتا ہے اور امریکی انتخابات میں نسبتاً کم استعمال ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں ووٹر کو اپنے بیلٹ پیپر کو حرفاً حرفاً پڑھنا پڑتا ہے اور ڈیموکریٹ یا ری پبلکن امیدوار پر نشان لگانا ہوتا ہے، دوسری صورت میں تو وہ صرف ری پبلکن یا ڈیموکریٹ پارٹی کے خانے پر نشان لگادیتے تھے۔

ہفتے کی رات تک سی این این نے ریاست نیواڈا میں ڈیموکریٹ سینیٹ امیدوار کیتھرین کورٹیز مستو کی جیت کی پیشگوئی کردی تھی۔ ان کی جیت سے یہ واضح ہوگیا تھا کہ سینیٹ میں ڈیموکریٹس کی برتری برقرار رہے گی۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ری پبلکن اس کو کنٹرول نہیں کریں گے اور اس لیے وہ قدامت پسند ایجنڈے کو آگے بڑھانے میں ناکام رہیں گے۔ ان کے ایجنڈے میں اسقاطِ حمل پر وفاقی پابندی اور جنگ زدہ یوکرین کے لیے تمام امداد کی بندش جیسے اقدامات شامل تھے۔

امریکی صدر جو بائیڈن اپنی کم مقبولیت کے باوجود وہ کام کرچکے ہیں، جو ۴۰ سالوں سے امریکا میں نہیں ہوا تھا۔ وہ اپنی پارٹی کو سینیٹ پر کنٹرول جاری رکھنے کی اجازت دینے میں کامیاب رہے اور کانگریس کی نشستوں میں فرق کو پہلے سے کم رکھا۔

اس ہفتے کے آغاز سے ہی طرفین غیر متوقع انتخابی نتائج کے لیے تیار تھے۔ جی۔۲۰ سربراہی اجلاس میں انڈونیشیا جاتے ہوئے صدر بائیڈن کو اپنی جیت کا احساس ہوا تو انہوں نے فوراً ہی صحافیوں کو بتایا کہ وہ انتخابات کے نتائج سے خوش ہیں۔

یہ بات واضح تھی کہ سابق صدر ڈونلڈ ٹرمپ ذاتی طور پر خفا تھے۔ ان کی ایک بیٹی کی شادی گزشتہ ہفتے ہوئی تھی اور ٹرمپ کی طرف سے جاری کردہ بیان میں کہا گیا کہ اس انتخابی نتائج سے وہ بری الذمہ ہیں۔

مزے کی بات یہ کہ سابق صدر ٹرمپ (جو اب بھی اس بات سے انکاری ہیں کہ وہ صدارتی انتخاب ہار چکے ہیں) نے اس انتخاب کے سب سے بڑے ری پبلکن فاتح یعنی فلوریڈا کے گورنر رون ڈی سینٹیس کا مذاق بھی اڑایا۔ شاید ایسا اس لیے کہ اگر ٹرمپ دوبارہ انتخاب لڑتے ہیں تو ممکنہ طور پر رون ڈی سینٹیس ہی انہیں چیلنج کریں گے۔

دنیا اس وجہ سے امریکی انتخابات پر نظر رکھتی ہے کیونکہ یہ دنیا میں امریکا کے عزائم اور طرزِ عمل کا تعین کرتے ہیں۔ اگر 'میک امریکا گریٹ اگین' والے ری پبلکن جیت جاتے تو یورپ اور خاص طور پر یوکرین اس کے فوری اور خطرناک اثرات کا نشانہ بنتے۔

ٹرمپ اور ان کے ساتھیوں کا تنہائی پسندانہ مؤقف ایک بار پھر دیگر عالمی معاملات اور خاص طور پر موسمیاتی تبدیلی پر امریکی عمل دخل کو کم کرے گا۔ امریکا میں اگلے ۲ سالوں میں ممکنہ طور پر ایک تعطل دیکھنے کو ملے گا اور کسی بھی فریق کے پاس اتنی طاقت نہیں ہوگی کہ وہ خارجہ اور ملکی پالیسی میں بڑے اقدام کرسکے۔

ایسا لگتا ہے کہ ایک طویل عرصے تک ٹرمپ اور ان کی اپیل ناقابلِ شکست تھی۔ لیکن اب امریکی ووٹروں نے دوسری طرف رخ کرلیا ہے۔ واشنگٹن کے قدامت پسند حلقوں میں اسی سوال پر سوچ بچار ہورہا ہے کہ ٹرمپ کی حمایت کا جواز کیسے پیش کیا جائے۔ اس سوال کا جواب جو بھی ہو بہرحال امریکا کے ووٹروں نے یہ دکھادیا ہے کہ وہ حقیقت کو سمجھنا شروع ہوگئے ہیں۔

"Why Trump lost".
(Daily "Dawn" Karachi. November 16, 2022)

ایلون مسک کا ''ٹوئٹر'' کیسا ہوگا؟

Diana Bossio

اس بات کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا جب ایلون مسک، ٹوئٹر ہیڈکوارٹر میں کچن کا سنک لیے داخل ہوئے جو ٹوئٹر پر ان کی ملکیت کا اشارہ تھا۔

ٹوئٹر صارفین نے پہلے ۴۴؍ارب ڈالر کے عوض ٹوئٹر کی فروخت کی خبر کو 'سنک اِن' ہونے دیا اور پھر اس بارے میں باتیں کرنا شروع کیں کہ ایلون مسک کا اگلا قدم کیا ہوگا۔

پہلے تو ٹوئٹر خریدنے سے متعلق اپنے ارادے سے مہینوں تک بھاگنے کی کوشش ہوئی مگر پھر عین اس وقت ٹوئٹر ایلون مسک کی نجی ملکیت بن گیا، جب اصل معاہدے کے نفاذ کے لیے ایک طویل اور ممکنہ طور پر شرمناک اور مہنگی قانونی چارہ جوئی شروع ہونے کو تھی۔

اگر ہم ماہرین کی رائے دیکھیں تو ان کے مطابق ایلون مسک نے ایک ایسے پلیٹ فارم کے لیے کچھ زیادہ ہی رقم کی ادائیگی کردی ہے جو نہ اپنے سرمایہ کاروں کے معیارات پر پورا اتر رہا ہے اور نہ ہی اپنے صارفین کے۔

ٹوئٹر کا کنٹرول حاصل کرنے کے بعد ایلون مسک کی جانب سے اٹھائے گئے ابتدائی اقدامات کی وجہ بھی شاید یہی تھی۔ ان اقدامات میں ٹوئٹر اکاؤنٹ پر بلیو ٹک کے لیے ماہانہ ۸ ڈالر (رقم کو ممالک کے حساب سے متعین کیا جائے گا) کی رقم وصولی کا ارادہ اور آدھے سے زیادہ ٹوئٹر عملے کو فارغ کرنے کی دھمکی دینا شامل تھا۔

انہوں نے مالک بنتے ہی اعلیٰ عہدیداران بشمول سی ای او پراگ اگروال، سی ایف او نیڈ سیگل، قانونی معاملات دیکھنے والی وجیا گڈے اور جنرل کونسلر سین ایجیٹ کو فارغ کردیا۔

ٹوئٹر کے مکمل اختیارات حاصل کرنے کے بعد ایلون مسک نے پہلا ٹوئیٹ کیا کہ 'پرندہ اب آزاد ہے'۔ شاید یہ ان کے ارادوں کی بہترین ترجمانی تھی۔

ٹوئٹر خریدنے سے پہلے وہ ٹوئٹر پر سب سے زیادہ اعتراض یہ کرتے تھے کہ یہاں اظہارِ رائے پر بے تحاشہ پابندیاں ہیں اور ٹوئٹر پر عوام کو آزادی دینے کے لیے ضروری ہے کہ اس میں اصلاحات لائی جائیں۔

اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ ایلون مسک ٹوئٹر کی کارکردگی کو مزید بہتر کرنے کے حوالے سے بیانات تو اچھے دے رہے ہیں، لیکن یہ دیکھنا ابھی باقی ہے کہ اسے ایک بے مثال ڈیجیٹل پلیٹ فارم بنانے کے لیے وہ کیا اصلاحات لائیں گے۔

ٹوئٹر کے نئے مالک نے مستقبل میں 'متنوع نقطہ نظر رکھنے والی کونٹینٹ ماڈریشن کونسل' کی تقرری کا اشارہ دیا ہے جسے مواد پر نگرانی اور معطل اکاؤنٹس کی بحالی کے بارے میں فیصلے کرنے کے اختیارات حاصل ہوں گے۔

یہ کوئی نیا خیال نہیں ہے۔ میٹا میں ۲۰۱۸ء سے ایک ایسا ہی بورڈ فعال ہے، جو سابق سیاسی رہنماؤں، انسانی حقوق کے سرگرم کارکنان، تعلیمی ماہرین اور صحافیوں پر مشتمل ہے۔ یہ بورڈ مواد کے حوالے سے لیے جانے والے فیصلوں کی نگرانی کرتا ہے اور کئی مواقعوں پر یہ سی ای او مارک زکر برگ کی جانب سے لیے گئے فیصلوں کی مخالفت کرتا بھی نظر آتا ہے۔

خصوصاً جب انتخابات میں ناکامی کے بعد سابق امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ کے حامیوں کی جانب سے واشنگٹن میں واقع کیپیٹل ہل کے باہر ہنگامہ آرائی کی گئی تب مارک زکر برگ نے ڈونلڈ ٹرمپ کو غیر معینہ مدت کے لیے فیس بک سے معطل کرنے کا فیصلہ کیا تھا، جس کی اس بورڈ نے مخالفت کی۔

ابھی یہ واضح نہیں کہ کیا ٹوئٹر کی یہ کونسل ڈونلڈ ٹرمپ پر عائد 'مستقل پابندی' کے فیصلے کو معطل کرنے سے متعلق ایلون مسک کے مشورے پر غور کرے گی اور کیا ایلون مسک اس بورڈ کو اپنے فیصلے معطل کرنے کا اختیار دیں گے یا نہیں۔

بہرحال ایسے بورڈ کے قیام کی تجویز دے کر ایلون مسک اپنے بتائے ہوئے آزادی اظہارِ رائے کے نظریات سے خود ہی ایک قدم پیچھے ہٹ گئے ہیں۔

کئی لوگوں کو خدشہ ہے کہ اظہارِ رائے پر ایلون مسک کی اعتدال پسندی کی پالیسی ٹوئٹر پر نفرت انگیز مواد میں مزید اضافے کا سبب بنے گی۔

گزشتہ ہفتے چند نفرت انگیز اکاؤنٹس نے نسلی اعتبار سے غیر مہذب گفتگو کر کے ایلون مسک کی زیرِ نگرانی چلنے والے ٹوئٹر کی حدود کو جانچنے کی کوشش کی۔ امریکا کے نیشنل کونسل جینئن ریسرچ انسٹیٹیوٹ کے مطابق ۲۸؍اکتوبر کو ٹوئٹر پر غیر مناسب الفاظ کے استعمال کی شرح ۵۰۰ فیصد سے زائد ریکارڈ کی گئی۔ تاہم ٹوئٹر کے سیفٹی اینڈ انٹیگ ریٹی شعبے کے سربراہ یوئل روتھ نے کہا کہ زیادہ تر توہین آمیز ٹوئٹس بہت محدود اکاؤنٹس سے کی گئی تھیں۔

مونٹکلیئر اسٹیٹ یونیورسٹی کے محققین کی جانب سے کی گئی ایک تحقیق میں بتایا گیا ہے کہ ایلون مسک کی ملکیت میں آنے کے بعد ٹوئٹر پر نفرت انگیز مواد میں بڑے پیمانے پر اضافہ دیکھنے میں آیا ہے۔

اس کے برعکس یوئل روتھ اور ایلون مسک دونوں نے تصدیق کی کہ 'ٹوئٹر کی پالیسیوں میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے' اور 'نفرت انگیز مواد' کے خلاف قوانین اب بھی پہلے کی طرح سخت ہیں۔

شاید ٹوئٹر پر ٹرولنگ سے زیادہ بڑا مسئلہ ایلون مسک کا رویہ ہے۔ انہوں نے امریکی ہاؤس اسپیکر نینسی پلوسی کے شوہر پال پلوسی سے متعلق ایک سازشی تھیوری ٹوئیٹ کی اور پھر اسے ڈیلیٹ کردیا۔ اس عمل کو تو ایلون مسک کی غیر مناسب باتیں کرنے کی عادت ٹھہرا کر نظر انداز کیا جاسکتا ہے لیکن اگر غلط معلومات اور ذاتی حملے کرنا ہی وہ آزادی ہے جس کو وہ ٹوئٹر پر فروغ دینا چاہتے ہیں، تو یوں ان کے آزادئ رائے کے نظریات پر کئی سوال اٹھ جاتے ہیں۔

ایلون مسک آن لائن مواصلاتی پلیٹ فارم کے استعمال سے ابھرنے والے سماجی مسائل کے لیے ٹیکنو کریٹک حکمتِ عملی اپنا رہے ہیں۔ یعنی مسک کا یہ خیال ہے کہ ٹیکنالوجی تک مفت رسائی 'آزادی اظہار' کی ثقافتی اور سماجی حدود کو ختم کردیتی ہے اور اسے سب کے لیے فوری اور آسانی سے دستیاب بنا دیتی ہے۔

لیکن اکثر ایسا نہیں ہوتا، اسی لیے ہمیں کمزور اور پسماندہ افراد کے تحفظ کے لیے مواد پر کسی قسم کے کنٹرول کی ضرورت ہے۔

ایک سوال یہ بھی اٹھتا ہے کہ کیا ہم ارب پتی افراد کو اپنی سماجی حدود پر براہِ راست اثر انداز ہونے کی اجازت دینا چاہیں گے؟ اگر اجازت دیں گے تو پھر صارفین کے مفادات کو مدِنظر رکھتے ہوئے ٹوئٹر کی شفافیت کو کیسے یقینی بنایا جائے گا؟

ٹوئٹر کا مالک بننے کے بعد ایلون مسک نے ٹوئٹر کو ہدایت کی کہ وہ بنیادی ڈھانچے کی سالانہ لاگت میں سے ایک ارب ڈالر بچائے، جو مبیّنہ طور پر کلاؤڈ سروسز اور سرور اسپیس میں کٹوتیوں سے ہی ممکن ہوسکتا ہے۔ ان کٹوتیوں کی وجہ سے غیر معمولی استعمال کے وقت ٹوئٹر کریش ہونے کے خطرات بڑھ جائیں گے، خصوصاً انتخابات جیسے مواقعوں پر۔

اور اسی لیے ایلون مسک کا ٹوئٹر کو 'ڈیجیٹل ٹاؤن اسکوائر' بنانے کا نظریہ ناکام ہوجاتا ہے۔ اگر ٹوئٹر کو ایسا پلیٹ فارم بنانا ہے جہاں عوام کو آزادی رائے کا کھلا موقع فراہم کیا جائے تو

پھر اس کے بنیادی ڈھانچے کو بھی اتنا مضبوط بنانا ہوگا جو اہم مواقعوں پر ٹوئٹر کی سروسز کو یقینی بنائے۔

فی الحال ایسی کوئی خبر تو سامنے نہیں آئی کہ بڑے پیمانے پر صارفین ٹوئٹر کو خیر باد کہہ رہے ہیں مگر کچھ لوگ بہر حال ایسے ضرور ہیں جو ٹوئٹر چھوڑ کر دیگر پلیٹ فارمز کا رخ کر رہے ہیں۔ ایلون مسک کے ٹوئٹر خریدنے کے بعد مختصر عرصے میں ہی #TwitterMigration ٹرینڈ کرنے لگا جبکہ دوسری جانب مائیکرو بلاگنگ پلیٹ فارم ''ماسٹوڈان'' پر لاکھوں صارفین کا اضافہ دیکھنے میں آیا ہے۔

''ماسٹوڈان'' کے سرورز آزاد ہیں اور انہیں صارفین خود مینیج کرتے ہیں۔ ہر سرور کی ملکیت، اس کے استعمال پر نگرانی اور چلانے کا نظام ایک مخصوص کمیونٹی کے اختیار میں ہوتا ہے اور وہ اسے اپنا ذاتی سرور بھی بنا سکتے ہیں۔ لیکن اس میں ایک خرابی یہ بھی ہے کہ سرور کو چلانے کے لیے رقم درکار ہوتی ہے اور اگر سرور ایک بار غیر فعال ہو گیا تو آپ اپنے تمام مواد سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔

ٹوئٹر سے نالاں صارفین نے ریڈ اِٹ، ٹمبلر، کاؤنٹر سوشل، لنکڈ اِن اور ڈسکورڈ کی جانب بھی رخ کیا ہے۔

بلاشبہ، بہت سے لوگ یہ جاننے کے لیے بھی بے چین ہیں کہ ٹوئٹر کے شریک بانی جیک ڈورسی صارفین کے لیے کیا متبادل لاتے ہیں۔ جیک جواب بھی ٹوئٹر کے شیئر ہولڈر ہیں، انہوں نے اپنا سوشل میڈیا نیٹ ورک شروع کیا ہے، جسے بلیو اسکائے سوشل کا نام دیا گیا ہے اور یہ ابھی اپنے آزمائشی مراحل میں ہے۔

بلیو اسکائے کا مقصد ایک اوپن سوشل میڈیا پلیٹ فارم کی فراہمی ہے، جس کا مطلب ہے کہ یہ واضح معیارات پر مختلف سوشل نیٹ ورکس کو ایک دوسرے کے ساتھ جڑنے کا موقع فراہم کرے گا۔

اگر بلیو اسکائے کا تجربہ کامیاب ہو گیا تو یہ ٹوئٹر کا ایک مضبوط حریف بن کر سامنے آئے گا۔ جس کے بعد صارف آسانی سے اپنے مواد سمیت ٹوئٹر سے دوسرے پلیٹ فارم پر باآسانی منتقل ہو سکے گا۔

سوشل نیٹ ورکنگ کی دنیا میں یہ صارف پر مرکوز بالکل نیا ماڈل ہوگا اور شاید یہ روایتی پلیٹ فارمز کو مجبور کرے کہ وہ اپنے موجودہ ڈیٹا جمع کرنے کے ذرائع اور اپنے آن لائن اشتہارات کے طریقہ کار پر دوبارہ غور کریں۔ ٹوئٹر کے اس نئے حریف کا سب کو بے صبری سے انتظار ہے۔

"Why Elon Musk's first week as Twitter owner has users flocking elsewhere".
("theconversation.com". November 4, 2022)

سری لنکا، بحران کا حل کیا ہے؟

Pasan Jayasinghe

سری لنکا کے عوام بھی اپنے صدر کی طرح آمرانہ سوچ کے حامل ہیں۔ ۱۹۷۸ء میں جب سے صدارتی نظام جے آر جائے وردھنے کے ذریعے نافذ کیا گیا، اس وقت سے جو بھی اس منصب پر براجمان ہوا وہ کسی نہ کسی صورت میں، اسی سوچ اور اندازِ حکمرانی کا حامل تھا۔ اگرچہ صدر اس عہد پر حکومت سنبھالتا ہے کہ وہ لبرل طرز پر کارِ حکومت چلائے گا، لیکن آنے والا وقت اسے بدترین آمر اور ظالم ہی ثابت کرتا ہے۔

جولائی ۲۰۲۲ء میں وکرما سنگھے نے معاشی زبوں حالی، دہشت گردی اور غیر یقینی صورتحال میں حکومت سنبھالی۔ یاد رہے وکرما سنگھے جو جے آر جائے وردھنے کا بھتیجا ہے، راجا پاکسے کے مستعفی ہونے کے بعد صدر منتخب ہوئے۔

اس طرح وکرما سنگھے سری لنکا کے دوسرے صدر ہیں، جو براہ راست ووٹوں سے منتخب نہیں ہوئے اور ایک مستعفی صدر کی جگہ آپ نے اس منصب کو سنبھالا۔ وکرما کو ابھی منصب سنبھالے ایک ہی دن ہوا تھا کہ انہوں نے فوج کو حکومت مخالف مظاہرین کو بے دردی سے کچلنے کا حکم دیا۔ وکرما سنگھے کے حکم سے مسلسل مظاہرین پر تشدد اور جبر کے بدترین ہتھکنڈے استعمال کیے جا رہے ہیں، انہیں گرفتار اور نظر بند کیا جا رہا ہے۔ یہ سب وکرما کو حاصل لامحدود طاقت اور اختیارات کے نام پر کیا جا رہا ہے۔ مظاہرین کو دہشت گردی ایکٹ میں گرفتار اور نظر بند کیا جا رہا ہے۔ اس ایکٹ کے مطابق کسی بھی شخص کو بغیر کسی وجہ اور الزامات کے گرفتار کیا جا سکتا ہے۔ گزشتہ چار دہائیوں سے سری لنکا کی حکومتیں، دہشت گردی کا الزام لگا کر مختلف افراد اور گروہوں کو طویل عرصے نظر بند یا گرفتار کر لیتی ہیں۔ ان پر بہیمانہ تشدد کیا جاتا ہے، بعض افراد کو لاپتا کر دیا جاتا ہے۔ اسی طرح تامل کمیونٹی اور ایسٹر بم دھماکے کے بعد مسلمانوں کے خلاف بڑے پیمانے پر پُرتشدد کارروائی کی گئی تھی۔

حال ہی میں ارگالیا کے مظاہرین کو دہشت گردی کے نام پر بدترین تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ ان میں طلبہ یونین اور مزدور یونین کے قائدین بھی شامل ہیں۔ حکومت مظاہرین کے خلاف مختلف حربے استعمال کر رہی ہے تاکہ ان کو حکومت مخالف سرگرمیوں سے باز رکھا جا سکے۔

وکرما سنگھے نے اپنے ان اقدامات سے جمہوری اور لبرل سوچ کی صریحاً نفی کر دی ہے، وکرما نے برسوں کی محنت اور کمال چالاکی سے عالمی برادری اور سری لنکا کے عوام کے سامنے اپنا لبرل اور جمہوری تاثر پیش کیا تھا۔ وکرما نے ماضی میں بھی آمروں کے غلط اقدامات میں ان کا ساتھ دیا تھا، اس طرح اس نے اپنے سابقہ کردار کو پھر سے دہرایا ہے۔ وکرما نے راجاپاکسے برادران کی کرپشن اور جرائم کو چھپانے اور انہیں تحفظ فراہم کرنے میں بھی مدد کی تھی، اگرچہ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ اپنے منصب کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے ان کا محاسبہ کرتے۔ ۱۹۸۰ء میں وکرما پر بدنام زمانہ بٹالنڈا عقوبت خانے کے حوالے سے بھی الزامات لگائے گئے تھے۔ اس وقت وکرما پوری منصوبہ بندی کے ساتھ جاری احتجاج اور مزاحمت کو کچلنے میں مصروف ہیں۔ تاہم، وہ کچھ عارضی نوعیت کے اقدامات کے ذریعے حالات میں بہتری اور استحکام کا تاثر دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔

سری لنکا کی اسٹیبلشمنٹ، صحافی، ماہر معاشیات، سول سوسائٹی کے نمائندے اور بہت سے وہ افراد جو راجاپاکسے کے دور حکومت میں انسانی حقوق کی خلاف ورزی پر احتجاج کر رہے تھے، آج یا تو خاموش ہیں یا وکرما کے جرائم کو کم کر کے بیان کر رہے ہیں۔

سری لنکا میں واضح طبقاتی تقسیم سے صدر کو فائدہ پہنچا ہے لیکن متوسط طبقہ اور امیر طبقہ بھی ان مظاہروں اور احتجاج میں شریک ہے۔ ایندھن کی عدم فراہمی اور بجلی کی طویل بندش نے عوام کا جینا دوبھر کر دیا ہے۔ وکرما سنگھے نے ان کے لیے احتجاج کے جواز کو اور آسان کر دیا ہے۔ یہ بات درست ہے کہ گرفتار مظاہرین میں بڑی تعداد غریب اور پسماندہ طبقے کی ہے۔ ان افراد کو متشدد ثابت کرنا اور معاشرے کے دیگر طبقات سے الگ گردانا نسبتاً آسان ہے۔

وکرما اور اس کے حامیان اس حقیقت کا ادراک نہیں کر پا رہے کہ ان کی حکومت کمزور بنیادوں پر کھڑی ہے، اور انہیں عوام کا مینڈیٹ بھی حاصل نہیں۔ اپنی مفادات اور مصلحتوں کو سامنے رکھ کر انہوں نے دیگر ہم خیال جماعتوں سے اتحاد کیا ہوا ہے لیکن ان کا یہ اتحاد غیر فطری اور بہت ہی کمزور ہے۔

////// باقی صفحہ نمبر ۱۰ \\\\\\

تنوّع پر برطانیہ کو ناز، ہندوستان گریزاں کیوں؟

Siddharth Varadarajan

رشی سوناک کے برطانیہ کے وزیر اعظم بننے پر ہندوستانیوں کو خوش ہونے کے بجائے حقیقت میں سنجیدگی سے اپنا جائزہ لینا چاہیے کہ ہزاروں سال سے ہماری معاشرت میں شامل ہمارے مذہبی تنوع اور ثقافتی تکثیریت کا کیا ہوا۔

میں ۱۹۷۹ء سے ۱۹۸۶ء تک لندن میں مقیم تھا۔ کسی تارکِ وطن کے طور پر نہیں، بلکہ ایک طالبعلم کے طور پر۔ لیکن اس مدت میں برطانوی زندگی اور اس کی معاشرت کا میں نے اس قدر مشاہدہ کر لیا تھا کہ آج اس کو چھوڑنے کے ۳۶ سال بعد بھی اس ملک نے کتنی ترقی کی ہے، اس کو بہتر طریقے سے سمجھ پاتا ہوں۔

میں ۱۴ سال کا تھا، جب میرے والد لندن میں تعینات تھے اور جب میں نیویارک گیا، تب میں ۲۱ سال کا تھا۔ میں نے ان سات سالوں میں ساؤتھ لندن کے ورکنگ کلاس ایریا کے ایک کمپری ہنسو اسکول سے اپنا 'او' اور 'اے' لیول مکمل کیا، اور لندن اسکول آف اکنامکس میں پڑھنے گیا۔ اس دوران مارگریٹ تھیچر انگلینڈ کی وزیر اعظم تھیں۔ اس وقت نیشنل فرنٹ اور برٹش نیشنل پارٹی کے فاشسٹ غنڈوں کے نسل پرستانہ تشدد کے واقعات عام تھے، اس کے ساتھ ہی پولیس کے نسل پرستانہ رویے، بالخصوص سیاہ فام کمیونٹی کے نوجوانوں کے ساتھ، زندگی کی ایک کھلی حقیقت تھی۔

مجھے کبھی کسی طرح کے جسمانی تشدد یا ذلت کا سامنا نہیں کرنا پڑا اور نہ ہی نسل پرستانہ تبصروں سے میرا زیادہ سابقہ پڑا۔ اسکول میں میرے پہلے یا دوسرے ہفتے میں لنچ بریک کے دوران فٹ بال کھیلتے ہوئے میرے پالے کا ایک برطانوی بچہ مجھ پر چلّایا، 'پاس دی بال، اسٹین!' (بال پاس کرو، اسٹین)۔ کھیل کے اختتام پر میں نے اسے بتایا کہ میرا نام اسٹین نہیں ہے، اور اس کے جواب پر میں قہقہہ لگائے بغیر نہیں رہ سکا، اس نے کہا تھا، 'میرا مطلب پاکستین کے اسٹین تھا'۔ مجھے یاد آتا ہے کہ اس کے جواب میں توہین کا ذرا سا بھی شائبہ نہیں تھا۔ اس نے 'پاکی' والے حصے پر زور نہیں دیا تھا۔ اس نے اور اس کے دوستوں نے میرا نام پوچھا اور کہا، اگر وہ مجھے 'سڈ' کہہ کر مخاطب کریں، تو مجھے کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا!

اس دن سے مجھے کبھی بھی (ان گوروں سے بھرے اسکول میں کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ لیکن یہ واضح تھا کہ برطانوی معاشرے کو نسل پرستی سے مسئلہ تھا، جسے آبادیاتی خوف دکھا کر اور برطانیہ کے تارکین وطن اور ان کی اولادوں کی حب الوطنی/ وفاداری کے بارے میں بے بنیاد سوال (دائیں بازو کے سیاست دانوں کی طرف سے) اٹھا کر طول دیا گیا تھا۔

جب میں انگلینڈ پہنچا تو عوامی زندگی میں سیاہ فام اور جنوب ایشیائی زیادہ نظر نہیں آتے تھے، لیکن جب میں یہاں سے نکل رہا تھا، اس وقت تک حالات بدلنا شروع ہو چکے تھے۔ ہندوستانی نژاد کمیونسٹ شاپور جی سکلت والا کی ۱۹۲۹ء میں بیٹرسی سیٹ پر شکست کے بعد سے کوئی بھی جنوب ایشیائی یا سیاہ فام شخص ہاؤس آف کامنس میں نہیں پہنچا تھا۔ لیکن ۱۹۸۷ء میں ڈائین اباٹ، پال بوٹینگ اور کیتھ واز اس کے لیے منتخب کیے گئے اور جلد ہی ایک سلسلہ چل نکلا۔

ایک ہندوستانی نژاد رکن پارلیمان کے انگلینڈ کے وزیر اعظم کے عہدے تک کے غیر معمولی سفر سے پہلے یہ میری مختصر سی روداد ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ رشی سوناک کی زندگی کا تجربہ اکثر تارکین وطن خاندانوں کی نمائندگی نہیں کرتا ہے، لیکن کسی کے پاس بھی انگلینڈ کا وزیر اعظم بننے والے مردوں یا عورتوں (تمام سفید فام) کی زندگی کا تجربہ نہیں ہے۔ برطانیہ میں زندگی کا ایک پہلو کئی دہائیوں سے نہیں بدلا ہے، اور وہ یہ ہے کہ یہاں کلاس (طبقہ) نسل کے نہلے پر دہلے کا کام کرتا ہے۔ لیکن یہ قصہ پھر کبھی۔

ہندوستان میں ہندوستانیوں نے سوناک کی تاج پوشی کی خبر کا خوشگوار حیرت اور فخر کے ساتھ خیر مقدم کیا۔ سنک کے لیے یہ ایک غیر معمولی شخصی حصولیابی ہے۔ لیکن اس عظیم الشان علامتی لمحے پر فخر کرنے کا سب سے زیادہ حق برطانوی عوام کو ہے۔ انہوں نے اپنے تنوع اور بوقلمونی کو قابل ذکر طریقے سے قبول کیا اور اس کا جشن منایا اور وہ ایسا کرنے والا واحد یورپی ملک نہیں ہے۔

آئرلینڈ اور پرتگال دونوں کے وزرائے اعظم ہندوستانی نژاد رہے ہیں۔ لیکن ہندوستان میں ہندوستانیوں کو خوشی منانے کے بجائے حقیقت میں سنجیدگی سے اپنا جائزہ لینا چاہیے کہ ہزاروں سال سے ہماری زندگی کا اٹوٹ حصہ رہے ہمارے مذہبی تنوع اور ثقافتی تکثیریت کا کیا ہوا؟ اس کے ساتھ ہی ذات پات کی بنیاد پر بہت سی برادریوں کے حقیقی یا علامتی بائیکاٹ کی اپنی تاریخ پر بھی غور کرنا چاہیے۔

پچھلی بار جب سوناک وزیر اعظم کے عہدے کے بڑے دعویداروں میں سے ایک تھے (جس میں وہ اس وقت کامیاب نہیں ہوئے تھے) تب کانچہ ایلیا نے اس 'عیسائی' برطانیہ کے ذریعے، ان کے لفظوں میں، اب کے 'ہندو' ہندوستان کو رواداری کے بارے سکھائے جا رہے سبق کی جانب ہماری توجہ مبذول کرائی تھی:

'برطانیہ نے ایک عیسائی نو آبادیاتی سامراج چلایا، پھر بھی آج وہی برطانیہ سوناک کو اعلیٰ عہدے کے لیے مقابلہ کرنے کی اجازت دے رہا ہے۔ برطانیہ میں اپوزیشن کے کسی رہنما حتیٰ کہ ان کی اپنی پارٹی کے وزارتِ عظمیٰ کے دیگر امیدواروں نے بھی ان کے مذہب پر سوال نہیں اٹھایا ہے۔ ان کے دولت کے بارے میں، ہاں۔ محنت کش طبقے کے ساتھ ان کے رویے کے بارے میں، ہاں۔ اور ان کی بیوی کے ذریعے ٹیکس چوری کے بارے میں، ہاں۔ کسی جمہوریت کے لیے یہ سب بہت اچھے سوال ہیں۔ (یہ الگ بات ہے کہ ہندوستان میں یہ سوال شاید ہی کبھی پوچھے جاتے ہیں)۔

اس صورتحال کا موازنہ ہندوستان سے کیجیے، جہاں حکومت میں ایک بھی مسلم وزیر نہیں ہے اور جہاں بھارتیہ جنتا پارٹی اور سنگھ پریوار نے ہندوستان کو مذہب، بالخصوص اسلام کے سوال پر پولرائزیشن کو اپنا مشن بنا لیا ہے۔ پارٹی لیڈر مسلمانوں کے خلاف زہر اگلنے اور اپنے ہندوتوا کا دعویٰ کرنے سے پہلے ایک پَل کے لیے بھی نہیں سوچتے۔ برطانیہ کے برعکس، ہندوستان کے حکمران نظام کی سیاسی بحث میں مذہب کا سوال سب سے اہم ہو گیا ہے۔

حتیٰ کہ وزیر اعظم مودی بھی اس سیاست میں شامل ہونے سے گریز نہیں کرتے۔ نائب صدرِ جمہوریہ حامد انصاری کی الوداعی تقریب میں ان کی تقریر کو یاد کیجیے، جس میں انہوں نے ایک کامیاب کیریئر والے سفارت کار اور سیاستدان کو ایک ایسے شخص میں محدود کر دیا جن کا کیریئر اسلام سے متعلق پوسٹنگ کی ایک 'منڈلی' (سرکل) تک محدود تھا۔

یا پھر شہریت (ترمیمی) ایکٹ کے خلاف احتجاج کرنے والے مسلمانوں کے بارے میں ان کا یہ بیان کہ کچھ لوگوں کو ان کے کپڑوں سے پہچانا جا سکتا ہے۔ ۲۰۱۹ء کے عام

////// باقی صفحہ نمبر ۲ \\\\\\

ایران میں پنپتی مزاحمتی تحریک

مریم سلیمان انیس

ایران میں لازمی حجاب کے قانون کے خلاف بڑھتے ہوئے احتجاج کے نتیجے میں حالات شدید خرابی کا شکار ہیں۔ سخت گیر حکمرانی کے خلاف تحریک بھی جاری ہے۔ یہ سب کچھ ایران میں شدید سیاسی و معاشرتی عدم استحکام کا باعث بن رہا ہے۔ ایسے میں ایرانی حکومت پاکستان سے ملحق سرحد کبھی کھولتی ہے اور کبھی بند کر دیتی ہے۔ پاکستانی صوبے بلوچستان سے ملحق ایرانی صوبوں سیستان اور بلوچستان میں کریک ڈاؤن بھی کیا جاتا رہا ہے۔ ایران اور پاکستان کے درمیان کئی سرحدی داخلے کے راستے ہیں۔ بلوچستان کے ضلع پنجگور کی تحصیل پاروم میں ایران پاکستان بارڈر چیک پوائنٹ کئی دن بند رہی ہے۔ چند ماہ کے دوران ایران بہت سے بارڈر چیک پوائنٹس کو کھولتا اور بند کرتا رہا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ کوئی بھی چیک پوائنٹ مستقل طور پر بند نہیں کیا گیا، تاہم مختلف چیک پوائنٹس کو بار بار کھولنے اور بند کرنے سے دونوں طرف کے ہزاروں خاندانوں کے افراد اور زائرین کو آمد و رفت میں شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ تجارت بھی بُری طرح متاثر ہوئی ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ پاکستان سے جڑے ہوئے ایرانی صوبوں میں سکیورٹی کی صورتِ حال دونوں طرف کے بلوچی بولنے والوں کے لیے شدید پریشانی اور تشویش کا باعث رہی ہے۔

نازش (فرضی نام) بلوچستان کے ایک کالج میں لیکچرر ہے۔ ایران کے صوبے سیستان بلوچستان میں کریک ڈاؤن نے نازش کو شدید تشویش میں مبتلا کیا ہے۔ سیستان اور بلوچستان میں نازش کے رشتہ دار اور احباب ہیں۔ اُن کی سکیورٹی کے حوالے سے یہاں شدید تحفظات پائے جاتے ہیں۔ ایران میں حکومتی اقدامات کے خلاف جاری احتجاج کی لہر جب انتہائی مشرق یعنی سیستان بلوچستان پہنچی تب یہاں صورتِ حال نازک ہوگئی۔

نازش کا کہنا ہے کہ جب بارڈر چیک پوائنٹ کھل جاتی ہے تب بھی سفر محفوظ نہیں ہوتا۔ چند ماہ کے دوران ایران کا سفر کسی بھی اعتبار سے مکمل محفوظ نہیں رہا۔ کچھ مدت سے سیستان بلوچستان میں سکونت پذیر بلوچ خاندانوں سے رابطہ رکھنا بھی انتہائی دشوار ہو چکا ہے۔ ان علاقوں کی سخت نگرانی کی جارہی ہے۔

ایران میں آباد بلوچ محض نسلی نہیں بلکہ مسلکی اقلیت بھی ہیں۔ اس کے باوجود انہوں نے ستمبر کے وسط سے شروع ہونے والے ملک گیر احتجاج میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ حالیہ احتجاج نے بلوچوں اور چند دوسری کمیونٹیز کو اپنے حقوق کے لیے احتجاج کرنے کا بھرپور موقع فراہم کیا ہے۔

کچھ مدت قبل سیستان بلوچستان میں ایک سرکاری سکیورٹی افسر نے ایک پندرہ سالہ لڑکی سے زیادتی کی۔ اس کے نتیجے میں ۳۰ ستمبر کو نمازِ جمعہ کے بعد سیستان بلوچستان کے صدر مقام زاہدان میں احتجاج شروع ہوا اور ہنگامے پھوٹ پڑے۔ تشدد کے نتیجے میں کم و بیش پچاس مظاہرین نے جان گنوائی۔

جب سیستان بلوچستان میں معاملات زیادہ خراب ہوئے تو ایرانی حکومت نے پاکستان سے ملحق سرحد پر تفتان کے مقام پر ایک اہم چیک پوائنٹ بند کر دیا۔ بعد میں تفتان چیک پوائنٹ کھول دیا گیا تاہم دونوں طرف کے خاندانوں کو آمد و رفت میں غیر معمولی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور دوطرفہ تجارت بھی بُری طرح متاثر ہوئی۔ تاجروں کا کہنا ہے کہ چیک پوائنٹس بند ہو جانے سے ان کا مال خراب ہو جاتا ہے۔

ایران میں لازمی حجاب کے قانون کے خلاف احتجاج ''خواتین، زندگی اور آزادی'' کے نعرے کے تحت ستمبر کے وسط میں شروع ہوا۔ احتجاج کی آگ میں مزید تیل اُس وقت پڑا جب ایرانی پولیس نے کرد نسل کی ۲۲ سالہ ایرانی لڑکی مہسا امینی کو نامناسب حجاب استعمال کرنے پر گرفتار کیا۔ مہسا امینی پولیس کی حراست میں جاں بحق ہوئی اور پولیس پر یہ الزام بھی عائد کیا گیا کہ اُس پر بہیمانہ تشدد کیا گیا تھا۔ اس موت کے نتیجے میں لوگوں میں شدید اشتعال پھیلا اور انہوں نے وسیع پیمانے پر احتجاج شروع کر دیا۔ زاہدان سمیت کئی ایرانی شہروں میں غیر معمولی نوعیت کے احتجاجی مظاہرے ہوئے۔ اصل میں لوگوں کا غصہ سخت گیر حکمرانی پر بھی تھا، جو باہر آنے کو بے تاب تھا۔ ایران میں سیاسی حقوق کی جدوجہد طویل مدت سے جاری ہے۔ خواتین کی ذاتی پسند و ناپسند پر قدغن لگانے کا سلسلہ ختم کرنے کے ساتھ ساتھ سیاسی خودمختاری کا بھی مطالبہ کیا جاتا رہا ہے۔

ایران میں ۱۹۷۹ء کے انقلاب کے بعد سپریم لیڈر آیت اللہ خمینی کی سخت گیر حکومت نے تمام خواتین کے لیے سر پر حجاب لینا لازم کر دیا تھا۔ تب سے یہ قانون ملک بھر میں تمام خواتین کے ساتھ ساتھ بیرون ملک سے آنے والی خواتین پر بھی لاگو ہوتا ہے۔ بیرونی سربراہانِ مملکت و حکومت اور سفیروں کے لیے ایران میں داخل ہوتے وقت حجاب کی پابندی لازم ہے۔

ایران کی حکومت نے ۱۹۹۰ء کے عشرے کے اوائل میں لازمی حجاب کے اصول پر عمل یقینی بنانے کے لیے قانونی اقدامات وضع کیے۔ ان کے تحت حجاب کی پابندی نہ کرنے پر سزائے قید کے علاوہ جرمانہ بھی عائد کیا جاسکتا ہے۔ ۲۰۰۵ء میں محکمۂ امر بالمعروف یعنی اخلاقی پولیس قائم کی گئی۔ اس کے قیام کا مقصد کم از کم لازمی لباس کے اصول کی پابندی یقینی بنانا تھا۔

ایران کے صحافی اور سیاسی کارکن مسیح علی نژاد کا کہنا ہے کہ ہم سے اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ ہم کپڑے کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے کے خلاف لڑ رہے ہیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ہم اپنی شناخت کے لیے برسرِ پیکار ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ چھوٹا سا مسئلہ کیسے ہوسکتا ہے جبکہ ایک سال کے دوران حجاب کے معاملے پر ۳۶ لاکھ خواتین کو گرفتار کیا گیا اور اس قانون کی تعمیل یقینی بنانے پر خطیر رقم خرچ کرنا پڑ رہی ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ ہم اس قانون سے آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں۔

ایرانی خواتین اپنے حقوق کے لیے چار عشروں سے لڑ رہی ہیں۔ لندن میں احتجاج کرنے والی ایک سیاسی کارکن فریبہ بلوچ نے بتایا کہ ایران میں خواتین کا اپنے حقوق کے لیے احتجاج کوئی نئی بات نہیں۔ ہاں، اس بار احتجاج کا دائرہ غیر معمولی طور پر وسیع ہے۔ یہ نئی بات ہے جس پر دنیا حیران ہے۔ فریبہ بلوچ نے بتایا کہ ایران میں جب سیاسی آزادی کے لیے کوئی تحریک چلائی جاتی ہے تو نسلی اور مسلکی اقلیتوں کے لوگ بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ وہ مختلف شکلوں میں امتیازی سلوک کا سامنا کرنے پر مجبور ہیں۔ ویسے دنیا بھر سے ایرانی مظاہرین کو جو حمایت و مدد ملی ہے وہ بھی قابلِ تحسین ہے۔

جب سے بڑے پیمانے پر ملک گیر احتجاج شروع ہوا ہے، کریک ڈاؤن میں کم و بیش پندرہ ہزار مردوں اور عورتوں کو گرفتار کیا جاچکا ہے اور سیکڑوں قتل ہو چکے ہیں۔ اس جبر اور تشدد کے باوجود ملک بھر میں لوگ ڈٹے ہوئے ہیں۔ اب خواتین کی ذاتی پسند و ناپسند بھی خطرے میں ہے، بہت ہو چکا۔ اب وہ میدان میں ہیں۔

امریکا کی یونیورسٹی آف البرٹا میں پی ایچ ڈی کی ایرانی طالبہ ریحانہ جوادی کہتی ہیں کہ ریاست خواتین کے لیے کپڑوں کے ڈیزائن تک کی پابندی عائد کر کے ان کے بنیادی

حقوق سلب کر رہی ہے۔ حکومتی نظام ان تمام خواتین کے خلاف غیر معمولی قوت کا مظاہرہ کر رہا ہے، جو لباس سے متعلق حکومت کے نافذ کردہ اصولوں کی پاسداری کے لیے تیار نہیں۔

ریحانہ جوادی مزید کہتی ہیں کہ حکومتی جبر کے خلاف احتجاج سے ایک بڑا فائدہ یہ پہنچا ہے کہ اب گھروں میں بھی حجاب کی پابندی کے خلاف مزاحمت پیدا ہونے لگی ہے۔ ایرانی معاشرے میں بعض معاملات غیر معمولی الجھنوں سے دوچار ہیں۔ خاندانی نظام برقرار ہے مگر اب بہت سے معاملات میں لوگ غیر ضروری جبر کے خلاف بولنے لگے ہیں۔

ایرانی معاشرے میں خواتین نمایاں حد تک خواندہ اور تعلیم یافتہ ہیں۔ اس وقت ایرانی معاشرے کی خواتین میں خواندگی کی شرح ۸۰ فیصد ہے جبکہ ۱۵ سے ۲۴ سال تک کی لڑکیوں میں خواندگی کی شرح ۹۸ فیصد تک ہے۔ جامعات میں طالبات نصف کی حد تک ہیں۔ ہاں، افرادی قوت کی بات کیجیے تو صرف ۲۰ فیصد ایرانی خواتین عملی زندگی بسر کر رہی ہیں۔ ایرانی پارلیمنٹ میں خواتین ارکان صرف پانچ فیصد ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ تعلیم ہی خواتین کو خود مختاری اور ترقی دیتی ہے مگر جب خواتین کو تعلیم سے ہم کنار کر کے گھر میں بٹھا دیا جائے تو ان کی زندگی کا معیار کسی بھی طور بلند نہیں ہوسکتا۔ حکومت کا فرض ہے کہ خواتین کو تعلیم کے ساتھ ساتھ عملی زندگی یقینی بنانے کے مواقع بھی فراہم کرے تاکہ وہ اپنی صلاحیت و سکت کو ڈھنگ سے بروئے کار لانے کے قابل ہوسکیں۔ ایرانی خواتین کو اس بات کی داد تو دینا ہی پڑے گی کہ وہ شدید مشکلات اور جبر کے باوجود کسی نہ کسی طور ترقی کی راہ ہموار کرنے میں کامیاب ہو ہی جاتی ہیں۔

ایرانی معاشرے میں خواتین اور مرد مختلف معاملات میں اپنے حقوق منوانے کے لیے مزاحمت کا دائرہ وسیع کرتے جا رہے ہیں۔ معاشرے میں عمومی سطح پر حجاب کے لیے قبولیت پائی جاتی ہے مگر حکومت اس معاملے میں سخت تر قوانین کے ذریعے معاملات کو بگاڑ کی طرف لے جا رہی ہے۔ اس کے نتیجے میں بغاوت پنپ رہی ہے اور خواتین حجاب کی سخت پابندیوں کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئی ہیں۔ ریحانہ جوادی کا کہنا ہے کہ مغربی لباس کے لیے ایرانی معاشرے میں غیر معمولی قبولیت نہیں تھی مگر جب حکومت نے سخت تر اقدامات شروع کیے اور لباس و حجاب کے حوالے سے نافذ کیے گئے قوانین کی خلاف ورزی پر کریک ڈاؤن قسم کے اقدامات شروع کیے تو لباس چھوٹے ہوتے چلے گئے۔ اس حوالے سے ایرانی معاشرے میں شدید کھنچاؤ کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ حکومت بھی پیچھے نہیں ہٹ رہی۔ اس کے نتیجے میں مزاحمت بڑھتی جا رہی ہے۔ خواتین شرعی احکام کو ماننے سے انکاری تو نہیں مگر جب معاملات میں سختی زیادہ برتی جاتی ہے تو مزاحمت بھی بڑھ جاتی ہے۔

ایران میں حکومتی اقدامات کے خلاف جاری تحریک بہت حد تک گھریلو نوعیت کی ہے تاہم اِسے بین الاقوامی سطح پر محسوس کیا گیا ہے۔ اس مزاحمتی تحریک کے لیے دنیا بھر سے حمایت کا اظہار کیا گیا ہے۔ پڑوس میں بھی اس تحریک کا کچھ نہ کچھ اثر پڑا ہے کیونکہ ایرانی سیستان بلوچستان اور پاکستانی صوبے بلوچستان میں ہزاروں خاندان منقسم ہیں۔ ایرانی سیستان بلوچستان میں رونما ہونے والے واقعات کا بلوچستان پر لازمی اثر مرتب ہوتا ہے۔ اگر ایران چاہے بھی تو پاکستان سے ملحق سرحد کو مکمل طور پر بند نہیں کرسکتا کیونکہ ایران سے پٹرولیم مصنوعات کی غیر قانونی تجارت دونوں ممالک کے سرحدی علاقوں میں رہنے والے منقسم خاندانوں کے لیے آمدن کا بڑا ذریعہ ہونے کے ساتھ ساتھ دونوں معیشتوں کے لیے کسی حد تک سہارا بھی ہیں۔ امریکی پابندیوں کے باعث ایرانی پٹرولیم مصنوعات کی فروخت خاصی محدود ہے۔ پاکستان میں اسمگل کیے جانے کے بعد ان کی فروخت کا امکان بڑھ جاتا ہے۔ یہ غیر قانونی تجارت عشروں سے جاری ہے۔ ایران بلوچستان کے راستے پاکستان کو پٹرولیم مصنوعات کی اسمگلنگ کے ذریعے خطیر رقم حاصل کرتا ہے۔ ایرانی معیشت کے لیے یہ اسمگلنگ بہت سود مند ہے۔ ایرانی سکیورٹی فورسز تھوڑی بہت نگرانی ضرور کرتی ہیں مگر مجموعی طور پر اسمگلروں کے خلاف کریک ڈاؤن سے گریز کیا جاتا ہے۔ ایران سے بہت سی دوسری مصنوعات بھی پاکستان اسمگل کی جاتی ہیں۔ کراچی کے متعدد علاقوں میں ایران کا خوردنی تیل بھی دھڑلے سے فروخت ہوتا ہے۔ ایرانی صابن، واشنگ پاؤڈر، کھجور، سبزیاں اور دوسری بہت سی چیزیں بلوچستان کے متعدد علاقوں اور کراچی میں سرِ عام فروخت ہوتی ہیں۔ ایرانی کنفیکشنری اشیاء بھی پاکستان میں بہت مقبول ہیں۔ ایران میں احتجاجی تحریک سے بہت پہلے دونوں ممالک نے سرحد پر باڑ لگانے کے حوالے سے بات چیت کی تھی مگر اب تک باڑ لگانے کے حوالے سے کچھ بھی نہیں کیا گیا ہے۔

اگر ایرانی حکومت یہ محسوس کرے کہ سرحدی صوبے میں سکیورٹی کی صورتِ حال خطرناک شکل اختیار کرسکتی ہے اور مزاحمتی تحریک میں حصہ لینے والے پاکستانی بلوچستان میں آسانی سے داخل ہوسکتے یا واپس آسکتے ہیں تب بھی وہ سرحد کو مکمل طور پر بند کرنے کی متحمل نہیں ہوسکتی۔

ایران میں حالیہ مزاحمتی تحریک محض حقوقِ نسواں کی تحریک نہیں ہے بلکہ حکومت کے سخت گیر رویے کے خلاف شدید مزاحمت دکھائی دے رہی ہے۔ لوگ تنگ آچکے ہیں اور اپنے اشتعال کو مزید نہیں دبا سکتے۔ محروم طبقات کو بنیادی حقوق کے لیے تحریک چلانے اور کچھ کر دکھانے کا اچھا موقع مل گیا ہے۔

(مریم سلیمان انیس کا تعلق گوادر سے ہے۔ وہ ترقیاتی امور کی ماہر اور فری لانس رائٹر ہیں۔)

(ترجمہ: محمد ابراہیم خان)

"Iran's mass protests are impacting lives in Pakistan". ("thediplomate.com". November 15, 2022)

بقیہ: سری لنکا، بحران کا حل کیا ہے؟

سری لنکا کے موجودہ حالات میں وکرما کی غلط پالیسیوں اور اقدامات کا بڑا دخل ہے۔ وکرما نے کمزور اور پسماندہ طبقات کے مفادات کے تحفظ کے بجائے بہت سارے ایسے فیصلے کیے ہیں جن سے یہی طبقہ سب سے زیادہ متاثر ہوا ہے۔

طلبہ اور مزدور یونین کے رہنماؤں کو گرفتار کرنے کی بنیادی وجہ راجا پاکسے کے خلاف احتجاج میں ان کا غیر معمولی کردار ہے۔ اس وقت سری لنکا کا بنیادی مسئلہ صرف وکرما سنگھے کے اقدامات نہیں بلکہ سیاسی ڈھانچا اور آئین میں تبدیلی بھی ناگزیر ہے۔ (ترجمہ: محمود الحق صدیقی)

"Why Sri Lanka has a tyrant as president — yet again". ("aljazeera.com". Oct 20, 2022)

بقیہ: گوانتاناموبے کا طویل ناانصافی پر مبنی قیدی

حسِ مزاح بھی برقرار ہے۔ اس تصویر میں وہ ہاتھ باندھے، سفید ٹی شرٹ میں ملبوس، طنزیہ مسکراہٹ لیے کراچی کے ایک میکڈونلڈ ریسٹورنٹ میں بیٹھے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ سیف اللہ پراچہ کو رہائی کے بعد جو توجہ ملی ہے، اس کے بعد وہ گم نامی میں چلے جائیں گے اور اپنی صحت بحال رکھنے کی مقدور بھر کوشش کریں گے۔ نیز، غروب ہوتے سورج سے لطف اندوز ہوں گے۔ یہ سب کچھ وہ اس طرزِ احساس کے ساتھ کریں گے کہ وہ ان خوش فہم صدور سے زیادہ اچھے ہیں جن کے دامن انسانیت کے خلاف مظالم سے داغ دار ہیں۔

(ترجمہ: جاوید احمد خورشید)

"American horror: POTUS after POTUS wronged this old Pakistani man". ("aljazeera.com". Nov 3, 2022)

چینی کمیونسٹ پارٹی کانگریس اور مغرب کے خدشات

افتخار گیلانی

چند سال قبل تین سینئر بھارتی صحافیوں کی معیت میں مجھے چین کے دورہ کے دوران تبت اور اس کے متصل یونان صوبوں کے دور دراز دیہی علاقوں کو دیکھنے کا موقع ملا۔ بلند و بالا پہاڑوں میں واقع دیہاتوں میں ضرورت کی ہر چیز اور جدید وسائل سے مالا مال اسکول و دیگر ادارے وغیرہ دیکھ کر یقین کرنا مشکل ہے کہ یہ ترقی بس پچھلی ایک دہائی کی دین ہے۔

تقریباً ہر دیہات کے کمیونٹی سینٹر میں اس علاقے کی پرانی تصویریں اور ماڈل رکھے ہوئے ہیں، تاکہ یہ سند رہے کہ ایک یا دو دہائی قبل اس گاؤں کی تصویر کیسی تھی۔ چین کی اس بے مثال ترقی کی وجہ سے کروڑوں افراد غربت کی لکیر سے نکل کر مڈل کلاس کے زمرے میں آ گئے ہیں۔

اگر بتایا جائے کہ ان دور دراز علاقوں میں سڑکوں پر سونا بچھایا گیا ہے، تو بے جا نہ ہوگا۔ بھارت کے دور افتادہ اور پسماندہ اروناچل پردیش کے توانگ علاقہ کی سرحد کے دوسری طرف چین کا زڈانگ شہر خوبصورتی، جدید وسائل اور بلند و بالا عمارتوں کے معیار کو لے کر کسی بھی یورپی شہر کو شرمندہ کر سکتا ہے۔

تبت کے دارالحکومت لہاسہ کی دو پہاڑیوں کے درمیان ایک مصنوعی جھیل بنائی گئی ہے۔ بلندی پر واقع دلائی لامہ کی سابق رہائش گاہ پوٹالہ پیلس سے اس کا نظارہ نہایت ہی خوش نما ہے۔ اس جھیل کے کنارے اس کا انچارج انجینئر مترجم کے ذریعے ہمیں بتا رہا تھا کہ اس جھیل کو بنانا سول انجینئرنگ کے نقطہ نظر سے نہایت ہی مشکل کام تھا، کیونکہ دریائے لہاسہ کا لیول اس کے نیچے تھا، اس لیے دریا کے بیڈ کو بلاسٹ کرنا پڑا۔

جب میرے ایک ساتھی نے سوال کیا کہ اس پروجیکٹ کی تعمیر میں کتنا وقت لگا، تو اس چینی انجینئر نے نہایت ہی ندامت اور پشیمانی کے ساتھ جواب دیا۔ ''کہ اس جھیل کو بنانے میں ڈیڑھ سال کا عرصہ لگا''۔ اس کے خیال میں یہ بہت زیادہ وقت تھا۔ ہم ہنس پڑے۔ جنوبی ایشیا میں ہمارے ملکوں میں تو پروجیکٹ رپورٹ بنانے میں ہی کئی دہائیاں لگ جاتی ہیں۔

چین اور ترکی دو ایسے ممالک ہیں، جو ۷۰ء اور ۸۰ء کی دہائیوں میں زندگی کے معیار کے حوالے سے بھارت اور پاکستان سے بھی گئے گزرے تھے۔ گو کہ یہ بحث طلب امر ہے کہ کیا اقتصادی ترقی و خوشحالی، آزادئ اظہار کا نعم البدل ہو سکتی ہے، مگر یہ بھی سچ ہے کہ چند دہائیوں میں ہی ایک مؤثر، پُرخلوص اور سنجیدہ قیادت کی بدولت یہ ممالک ترقی کی منزلیں طے کرتے گئے اور ان کا ہر شہر یا گاؤں اس وقت ٹیکنالوجی پر مبنی ضروریاتِ زندگی، بنیادی ڈھانچہ، وسائل اور عوام کو سوشل سیکورٹی کور دینے کے اعتبار سے یورپ یا امریکا سے کہیں آگے ہیں۔

۱۹۷۸ء میں چینی لیڈر ڈنگ ژاؤ پنگ نے معاشی اصلاحات کا جو بیڑا اٹھایا اور جس طرح اب موجودہ سربراہ شی جن پنگ نے ان کو آگے بڑھایا، انہوں نے چاہے ملٹری ہو یا اقتصادی وسائل، چین کو تقریباً امریکا کے برابر کھڑا کر دیا ہے۔ ڈنگ ژاؤ پنگ نے جس وقت آہنی دیوار میں شگاف کر کے معاشی لبرلائزیشن کا اعلان کر کے مارکیٹ اکانومی کو اپنایا، تو تب تک چینی کمپنیاں اس لیول تک پہنچ چکی تھیں کہ وہ مغربی دنیا کی مسابقت کر سکیں۔

مغربی کمپنیوں کو چین جیسی وسیع مارکیٹ تو ملی، مگر اس سے بڑی مارکیٹ چینی کمپنیوں کو حاصل ہوگئی۔ اس کے برعکس بھارت نے جب ۱۹۹۱ء میں معاشی لبرلائزیشن کا اعلان کیا تو اس کی کمپنیاں مسابقت کے لیے تیار ہی نہیں تھیں۔ جس کی وجہ سے ملک میں مینوفیکچرنگ تقریباً منجمد ہوگئی ہے۔ بھارت کی اپنی ایمبسڈر کار جس کی مارکیٹ پر اجارہ داری تھی، لبرلائزیشن کے بعد نظر ہی نہیں آ رہی ہے۔ ہاں انگریزی زبان سے واقفیت کی وجہ سے سروس سیکٹر میں بھارت کو برتری مل گئی۔

امریکا کی ۱۹ء۴ ٹریلین ڈالر کے مقابلے چین کی اکانومی کا حجم ۱۲ء۲ ٹریلین ڈالر ہے۔ دس سال قبل یہ تین ٹریلین ڈالر سے بھی کم تھی۔ ۲۰۱۱ء میں ہو جن تاؤ کے اقتدار کے آخری مہینوں کی سب سے بڑی خبر تھی کہ چین نے جاپان کی اکانومی جو اُن دنوں تین ٹریلین ڈالر کے لگ بھگ تھی، کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔

جاپان اس وقت چار ٹریلین ڈالر کی اکانومی کے ساتھ تیسرے نمبر پر ہے اور چین سے کوسوں پیچھے ہے۔ لگ بھگ چین کی ہی جتنی آبادی والے ملک بھارت کی اکانومی کا حجم بس ۲ء۶ ٹریلین ڈالر ہے۔ الیکٹرک کاریں بنانے میں چین اس وقت ورلڈ لیڈر ہے۔

چین کی اسی بڑھتی ہوئی اقتصادی اور فوجی طاقت کی وجہ سے بیجنگ کے گریٹ ہال میں منعقد چینی کمیونسٹ پارٹی کی بیسویں کانگریس پر سب کی نگاہیں ٹکی ہوئی تھیں۔ اس طرح کی کانگریس پانچ سال کے بعد ہوتی ہے، اس میں حکومت کی کارکردگی پر بحث و مباحثہ کیا جاتا ہے اور مستقبل کے لیے پالیسی کی سمت کا تعین کیا جاتا ہے۔

اس کانگریس کے اختتام پر فیصلہ کیا گیا کہ جنگی جذبے کے ساتھ اندرونی چیلنجوں کا مقابلہ کیا جائے گا اور دنیا میں طاقت کے بدلتے توازن کا بھرپور فائدہ اٹھا کر دنیا کے سامنے ایک نیا تزویراتی ویژن رکھا جائے گا۔ یہ اشارہ اقوام عالم میں امریکا کی گرتی ہوئی ساکھ اور چین کی طرف سے اس خلا کو پُر کرنے کے عزم کا اظہار تھا۔ جس نے امریکا اور مغربی ممالک میں خطرے کی گھنٹیاں بجا دی ہیں۔

بیجنگ میں ملک بھر سے آئے ۲۳۰۰ ڈیلی گیٹس نے طویل مدتی اثرات کے حامل فیصلے کرتے ہوئے پارٹی کے ایک ڈھانچے کی بھی منظوری دی۔ یعنی ایک نئی ۲۴ رکنی پولٹ بیورو اور اس کے اندر سات رکنی پولٹ بیورو اسٹینڈنگ کمیٹی (پی ایس سی) جو ایک طرح سے سپر کیبنٹ کا کام کرتی ہے کا قیام عمل میں لایا۔

اس میں چار نئے چہروں، لی کیانگ، کائی کیو، ڈنگ ژوکسیانگ، اور لی ژی کو جگہ مل گئی اور ظاہر ہے کہ یہ چین کے مستقبل کے لیڈران ہوں گے۔ پرانے رہنماؤں میں ژاؤ لیجی اور وانگ ہننگ نے اپنی رکنیت برقرار رکھی۔

ماہرین کا کہنا ہے کہ ۶۹ سالہ صدر شی جن پنگ نے جن کو تیسری بار کمیونسٹ پارٹی کے لیڈر کے طور پر اگلے پانچ سال کے لیے پھر منتخب کیا گیا، پی ایس سی کو اپنے وفاداروں سے بھر دیا ہے۔ جن اراکین کی طرف سے موہوم سا بھی اختلافِ رائے کا خدشہ تھا، ان کو باہر کا راستہ دکھایا گیا ہے۔

اسی قدم نے مغربی ممالک کے تجزیہ کاروں کی نیندیں حرام کر کے رکھ دی ہیں۔ ان کے مطابق اس کا مقصد یہ ہے کہ ملک کی تاریخ کے سب سے زیادہ بااثر حکمران کے طور پر اپنے آپ کو منوانے کے بعد شی جن پنگ اب کوئی اہم قدم اٹھانے والے ہیں، جس کو منوانے اور عملی جامہ پہنانے کے لیے پارٹی اور حکومت کے اندر انہوں نے راستے صاف کر دیے ہیں۔ وہ چینی کمیونسٹ پارٹی کی سیاست میں اتنی طاقت حاصل کرنے والے پہلے شخص بن گئے ہیں۔

انت کرشنن، جو بیجنگ سے بھارت کے معروف اخبار ''دی ہندو'' کے لیے لکھتے ہیں، کا کہنا ہے کہ ماضی میں، اختیارات عام طور پر مختلف پارٹیوں کے دھڑوں کے درمیان

بٹتے تھے، مگر یہ شاید پہلی بار ہے کہ جب پوری طاقت شی جن پنگ نے اپنے ہاتھوں میں مرکوز کی ہے۔ صدر کے عہدے پر فائز ہونے کے علاوہ، شی اب چینی کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سیکرٹری، پی ایس سی اور پولٹ بیورو دونوں کے سربراہ، چینی کمیونسٹ پارٹی کے مرکزی فوجی کمیشن کے چیئرمین، اور عوامی جمہوریہ چین کے مرکزی فوجی کمیشن کے چیئرمین ہیں۔ تکنیکی طور پر یہ ایک ہی نام کے دو دفاتر ہیں۔ اگلے پانچ سالوں میں پارٹی کے اندر وہ اب اپنے سیاسی اور معاشی نظریہ کو بہت آسانی کے ساتھ آگے بڑھا سکیں گے۔

دیگر تقرریوں میں، وزیر خارجہ وانگ یی (۶۹) کو پولٹ بیورو میں ترقی دی گئی، جس کا مطلب ہے کہ وہ ریٹائر ہونے والے یانگ جیچی سے عہدہ سنبھالیں گے، جو اس وقت سنٹرل فارن افیئر کمیشن کے جنرل آفس کے ڈائریکٹر کے طور پر خدمات انجام دے رہے ہیں۔ یہ چینی ڈپلومیسی کا سب سے اونچا عہدہ ہے۔ وزیر خارجہ ان کو ہی رپورٹ کرتا ہے۔

امریکا میں موجودہ سفیر کن گینگ کو سنٹرل کمیٹی کا ممبر بنا کر ترقی دی گئی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اب اگلے سال مارچ سے ملک کے نئے وزیر خارجہ ہوں گے اور اسی کے ساتھ بھارت کے ساتھ سرحدی تنازعات پر بات چیت کے لیے خصوصی نمائندے کا عہدہ بھی سنبھالیں گے۔ پولٹ بیورو میں ایک اور تقرری لیو ہائیکسنگ کی ہے، جو معاون وزیر خارجہ تھے اور یورپی امور کے ماہر سمجھے جاتے ہیں۔ روس یوکرین جنگ اور یورپ پر سفارتی توجہ کے تناظر میں یہ ایک اہم تقرری ہے۔

اسی کے ساتھ جنرل ہی ویڈونگ (۶۵) کو سینٹرل ملٹری کمیشن کا نیا نائب چیئرمین نامزد کیا گیا ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ انہیں سخت تناؤ کے دوران بھارت کی سرحد سے متصل مغربی تھیٹر کمانڈ میں فوج کی قیادت کرنے کے لیے یہ صلہ ملا ہے۔ پولٹ بیورو میں کسی بھی خاتون کی عدم موجودگی اور نائب وزیر اعظم ہوچن ہوا، سنکیانگ ریجن میں کمیونسٹ پارٹی کے سابق سیکرٹری چن کوانگوا، لی کی چیانگ اور وانگ یانگ جیسے اعتدال پسند چہروں کے اخراج نے سبھی کو حیران کر کے رکھ دیا ہے۔ لی اور وانگ کو اپنی کم عمری کی وجہ سے کمیونسٹ پارٹی کے اعلیٰ اداروں میں لمبی اننگز کھیلنے کے لیے سمجھا جاتا تھا۔ دونوں نے کمیونسٹ یوتھ لیگ میں خدمات انجام دی تھیں، جو ایک زمانے میں ایک بااثر گروپ تھا۔

ماہرین کا کہنا ہے کہ سپر کیبنٹ یا پی ایس سی نے نئے اراکین میں سب سے اہم تقرری شی جی پنگ کے ۶۰ سالہ پرائیویٹ سیکرٹری ڈنگ ژوکسیانگ کی ہے۔ وہ اس وقت پولٹ بیورو کے سب سے کم عمر ممبر ہیں۔ ان کو ایک گیٹ کیپر کے نام سے جانا جاتا ہے۔ کیونکہ شی سے ملاقات سے قبل کسی کو بھی ڈنگ کی جانچ پڑتال سے گزرنا پڑتا تھا۔ وہ اس وقت مرکزی کمیٹی کے طاقتور ترین جنرل آفس کے سربراہ ہیں، جو اعلیٰ قیادت کے انتظامی امور کی دیکھ بھال کرتا ہے۔

اگرچہ، درجہ کے لحاظ سے وہ چھٹے نمبر پر ہیں، مگر بتایا جاتا ہے کہ مستقبل میں بیجنگ میں اقتدار کی راہداریوں میں اہم کردار ادا کریں گے۔ وہ ایک ایسے شخص ہیں، جن کے اوپر دنیا بھر کے تجزیہ کاروں کی نظریں لگی ہوئی ہیں۔ وہ مستقبل میں چین میں کوئی اہم کردار ادا کر سکتے ہیں اور شاید عنقریب ہی، شی کے جانشین کے طور پر ابھر سکتے ہیں۔ ۲۰۱۲ء میں وہ ۱۸ویں پارٹی کانگریس میں شنگھائی میونسپل پارٹی کمیٹی کی سیاسی اور قانونی کمیٹی کے سیکرٹری بنائے گئے تھے اور مرکزی کمیٹی کے لیے منتخب ہوئے۔

اسی طرح ۶۳ سالہ لی کیانگ، جنہوں نے زرعی مکینکس کے ساتھ ساتھ سماجیات کی تعلیم بھی حاصل کی ہے، کو بھی چینی سیاست میں ایک ابھرتے ہوئے ستارے کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ خیال کیا جاتا تھا کہ شنگھائی میں لاک ڈاؤن نے ان کی شبیہ کو نقصان پہنچایا ہے۔

وہ نہ صرف پی ایس سی کے دوبارہ ممبر منتخب ہوئے ہیں، بلکہ ان کو وزیر اعظم کے لیے بھی نامزد کیا گیا ہے۔ وہ مارچ ۲۰۲۳ء میں عہدہ سنبھالنے والے ہیں۔ ۶۵ سالہ ژاؤ لیجی پی ایس سی کے تیسرے نمبر کے رکن ہیں اور ان کے مارچ ۲۰۲۳ء میں پی ایس سی کے چیئرمین بننے کی امید ہے۔ وہ ۲۰۱۷ء سے ہی اس اعلیٰ ادارے کے رکن ہیں۔ وہ مرکزی کمیشن برائے نظم وضبط کے سیکرٹری بھی ہیں۔ وہ پارٹی کے سب سے اعلیٰ داخلی کنٹرول ادارے جسے شی نے بدعنوانی کے خلاف مہم چلانے کے لیے بنایا تھا، کی سربراہی کرتے ہیں۔

انہوں نے پچھلے پانچ سالوں میں پارٹی اور حکومت کے ۴۰۰ اعلیٰ عہدیداروں کو سخت سزائیں دے کر کرپشن کے خلاف ایک طرح سے اعلان جنگ کیا ہوا تھا۔ ۶۷ سالہ وانگ ہننگ بھی ۲۰۱۷ء سے پی ایس سی کے رکن تھے۔ انہیں کمیونسٹ پارٹی کے چیف نظریہ ساز کے طور پر جانا جاتا ہے اور ان کا پالیسی اور فیصلہ سازی پر خاصا اثر ورسوخ رہا ہے۔

ایک خاص بات یہ ہے کہ اگلے پانچ سال تک چونکہ فیصلہ سازی کا کلی اختیار شی کے پاس رہے گا، اس کا مطلب ہے کہ فیصلے زیادہ تیزی کے ساتھ ہوں گے۔ مگر ان فیصلوں میں غلطی ہوتی ہے، تو اس کو ٹھیک کرنے کا کوئی نظام وضع نہیں ہے۔ چونکہ یہ فیصلے نہ صرف چین بلکہ پوری دنیا پر اثر انداز ہو سکتے ہیں، اس لیے شاید مغربی ممالک کے یہ خدشات بجا ہیں کہ کہیں شی پاور مرکوز کر کے روسی صدر ولادیمیر پوتن کا رویہ نہ اختیار کریں۔ جنہوں نے یوکرین پر فوج کشی کر کے اس وقت مغربی دنیا کا ناطقہ بند کیا ہوا ہے۔

چین میں روایتی طور پر پارٹی اور حکومت کے اندر لیڈرشپ کو سخت احتساب کے عمل سے گزرنا پڑتا ہے۔ گو کہ فیصلہ سازی کے عمل کی خبریں باہر نہیں آتی ہیں، مگر اس پر خاصا بحث ومباحثہ ہوتا ہے اور صدر یا پارٹی سربراہ کو دیگر لیڈران کو قائل کرنے میں دانتوں پسینہ آتا ہے۔ تجزیہ کاروں کے مطابق شی نے اس چیک اور بیلنس سسٹم کو کمزور کر دیا ہے۔ مگر شاید شی کو چین کو فوجی فیلڈ اور ٹیکنالوجی کے سیکٹر میں امریکا کی برابری کرنے کی سخت جلدی ہے۔ اس لیے وہ کوئی اہم اور سخت فیصلے کرنا چاہتے ہیں، جو اسی صورت میں ممکن ہیں، جب ان کی اندر سے مخالفت نہ ہو اور پوری لیڈرشپ اس کے حق میں ہو۔

اس خدشہ کا سدباب کرنے کے لیے امریکا نے چین کے خلاف مختلف بہانوں کو لے کر کئی اقتصادی پابندیاں لگانے کا اعلان کیا ہے، جس میں سب سے اہم چین کو سیمی کنڈکٹر کی فراہمی روکنا ہوگا۔ امریکی کمپنیوں کے لیے چین سیمی کنڈکٹر کی سب سے بڑی منڈی تھی۔ یہ کنڈکٹر جدید خودکار ہتھیاروں، روبوٹ، سپر کمپیوٹر اور دیگر اعلیٰ تکنیکی اشیا کے بنانے میں استعمال کی جاتی ہیں۔ مختصر مدت کے لیے شاید چین کی ترقی کی رفتار تھم تو سکتی ہے، مگر ماہرین کے مطابق اس کو روکنا مشکل ہے۔ ان سیمی کنڈکٹر کو بنانے کے لیے نایاب زمینی معدنیات یعنی Rare Earth Minirals کی ۸۰ فیصد مارکیٹ چین کے پاس ہے۔

افغانستان میں بھی اس کے وسیع ذخائر پائے جاتے ہیں، جو چین کی دہلیز پر ہی ہے۔ ماضی میں جب بھی چین پر پابندیاں لگی ہیں، تو اس نے وہ اشیا خود ہی بنانے میں کامیابی حاصل کی ہے۔

شاید اسی لیے اس ۲۰ویں کانگریس نے نئی لیڈرشپ میں انجینئرنگ پس منظر رکھنے والے افراد کو کلیدی ذمہ داریاں دی ہیں۔ اس سے لگتا ہے کہ ملٹری کی جدید کاری اور تکنیکی ترقی پر شی کی پوری توجہ مرکوز ہوگی، تاکہ چین کو دنیا میں تکنیکی اعتبار سے بھی امریکا کے ایک معتبر متبادل کے بطور پیش کیا جا سکے۔

(بحوالہ: روزنامہ ''۹۲ نیوز'' کراچی۔ یکم نومبر ۲۰۲۲ء)

پاکستان 'ایک فیصد لوگوں کا ملک'

مفتاح اسماعیل

میں نے گزشتہ سال ایک ٹیڈ ایکس ٹاک میں کہا تھا کہ پاکستان کو اسلامک ری پبلک کے بجائے ون پرسنٹ ری پبلک (ایک فیصد لوگوں کا ملک) کہنا چاہیے۔

یہاں پر مواقع، اختیار اور دولت سب کچھ ایک فیصد افراد تک محدود ہے۔ دیگر کو ایسے مواقع ہی دستیاب نہیں کہ وہ کامیاب ہوسکیں۔ یوں پاکستان کی معیشت کا دارومدار صرف ان چیزوں پر ہوتا ہے جو ملک کی اشرافیہ حاصل کرتی ہے۔ یہ معیشت اس وجہ سے ترقی نہیں کرتی کیونکہ ملک کی اکثریت کی صلاحیتوں کو نظرانداز کردیا جاتا ہے۔

فرض کریں کہ ہم کرکٹ ٹیم میں شمولیت کے لیے صرف ان کھلاڑیوں کا انتخاب کریں جو نومبر کے مہینے میں پیدا ہوئے ہوں۔ ظاہر ہے کہ اس طرح ہم ایک کمزور ٹیم تیار کریں گے کیونکہ اس کا انتخاب صرف ۲ فیصد آبادی سے ہوگا۔ اگر ایسا ہوتا تو ہماری ٹیم نا جانے کتنے ہی بہترین کھلاڑیوں کی صلاحیتوں سے بھی فائدہ نہ اٹھا پاتی جو ماضی میں گزرے۔ بالکل اسی طرح کی صورتحال بااختیار لوگوں کے انتخاب میں بھی ہوگی اور جس طرح ہماری ٹیم ہارتی رہے گی اسی طرح ہم بحیثیت قوم بھی ہارتے رہیں گے۔

رواں سال تقریباً ۴۰ لاکھ پاکستانی بچے ۱۸ سال کی عمر کو پہنچیں گے۔ ان میں ۲۵ فیصد سے بھی کم انٹرمیڈیٹ کریں گے اور ۳۰ ہزار کے قریب او/ اے لیول کریں گے۔ ۳۰ لاکھ سے زیادہ یا ۷۵ فیصد بچے ۱۲ سالہ تعلیم بھی مکمل نہیں کرسکیں گے۔ (پاکستان میں تقریباً نصف بچے اسکول نہیں جاتے)۔ اے لیول کرنے والے ۳۰ ہزار بچے ہماری بہترین یونیورسٹیوں میں غالب رہیں گے۔ ان میں سے کئی بیرونِ ملک تعلیم حاصل کریں گے اور رہنما بن جائیں گے۔ یہ ۱۸ سال کی عمر کے تمام افراد کا ایک فیصد سے بھی کم بنتے ہیں۔ یہی وہ پاکستانی ہیں جن کے لیے پاکستان کام کرتا ہے۔ لیکن معاملہ مزید خرابی کی جانب جارہا ہے۔

پاکستان میں تقریباً ۴ لاکھ اسکول ہیں مگر اس کے باوجود کئی سالوں سے ہمارے سپریم کورٹ کے جج حضرات اور کابینہ اراکین کی نصف تعداد صرف ایک اسکول سے آتی ہے اور وہ ہے ایچیسن کالج لاہور۔ کراچی گرامر اسکول بے شمار چوٹی کے پروفیشنل اور امیر ترین کاروباری افراد تیار کرتا ہے۔ اگر ہم ۳ امریکی اسکولوں، کیڈٹ کالج حسن ابدال اور چند مہنگے نجی اسکولوں کے طلبہ کی تعداد جمع کرلیں تو وہ شاید ۱۰ ہزار کے قریب بنے گی۔ ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ بچوں کی یہ قلیل تعداد مستقبل میں پاکستان کے اندر مختلف شعبوں میں اہم ترین عہدوں پر ہوں گے، بالکل ویسے ہی جیسے آج ان کے والد اہم عہدوں پر ہیں۔

۵۰ سال قبل ڈاکٹر محبوب الحق نے ان ۲۲ خاندانوں کی نشاندہی کی تھی جو تمام لسٹڈ مینوفیکچرنگ کے دو تہائی اور بینکنگ اثاثوں کے ۸۰ فیصد کو کنٹرول کرتے ہیں۔ یہ دولت کے غیر معمولی ارتکاز کی نشاندہی کرتا ہے۔ آج ہم بھی ایسے کتنے ہی خاندانوں کی نشاندہی کرسکتے ہیں جو قومی دولت کے خاطر خواہ حصے کو کنٹرول کرتے ہیں۔

دولت کا ارتکاز صرف پاکستان میں نہیں ہوتا بلکہ یہ پوری دنیا میں ہی ہوتا ہے اور ترقی پذیر ممالک میں تو خاص طور پر ہوتا ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ ڈاکٹر محبوب الحق کی جانب سے کی گئی نشاندہی کے بعد بھی تقریباً وہی خاندان ہیں جو آج بھی دولت کو کنٹرول کرتے ہیں۔

ایک کامیاب معیشت نئے کاروباری لوگوں کو جگہ دیتی ہے جو نئی اور ابھرتی ہوئی صنعتوں اور ٹیکنالوجی کی نمائندگی کرتے ہیں اور امیر ترین بن جاتے ہیں۔ لیکن پاکستان میں ایسا نہیں ہوتا، یہاں تو اختیار اور مواقع صرف اس اشرافیہ تک محدود ہیں جو کبھی تبدیل نہیں ہوتی۔

آپ امریکا کے بڑے کاروباری افراد جیسے بل گیٹس، مارک زکربرگ اور جیف بیزوس وغیرہ کو دیکھیں تو ان میں سے کوئی بھی اپنے خاندان کی دولت کے بل بوتے پر اس مقام تک نہیں پہنچا۔ اگر ماضی کی بات کی جائے تو کارنیگی اور راکیفیلر اب تجارت اور کاروبار پر غلبہ نہیں رکھتے۔ اگر ماضی قریب کے سابق امریکی صدور کو دیکھیں تو رونلڈ ریگن کے والد ایک سیلز مین تھے، بل کلنٹن کے والد ایک شرابی تھے اور باراک اوباما کی پرورش ان کی والدہ نے اکیلے کی تھی۔ لیکن یہاں پاکستان میں ہر پاکستانی کی کامیابی کے پیچھے اس کے والد کی حیثیت اور مقام ہوتا ہے۔

پاکستان میں ڈاکٹر کا بچہ ڈاکٹر، وکیل کا بچہ وکیل اور عالم دین کا بچہ عالم دین ہی بنتا ہے۔ یہاں تک کہ گلوکاروں کے بھی گھرانے ہی ہوتے ہیں۔ یہاں ایسے کئی کاروباری، سیاسی، عسکری اور بیوروکریٹک گھرانے موجود ہیں جہاں کئی نسلوں سے سیٹھ، سیاستدان، جنرل اور اعلیٰ افسران پیدا ہوتے رہے ہیں۔ ایسے معاشرے میں ڈرائیور کا بیٹا ڈرائیور، کسی جمعدار کا بیٹا جمعدار اور ایک نوکرانی کی بیٹی نوکرانی بننے تک ہی محدود رہتی ہے۔

ہمارے چوٹی کے کاروباری افراد اور دیگر پروفیشنل صرف انگریزی میڈیم پڑھی لکھی شہری اشرافیہ سے ہی تعلق رکھتے ہیں، ان میں خاص طور پر ان ۲ اسکولوں کے لوگ ہوتے ہیں جن کا اوپر ذکر آچکا ہے۔ عام لوگ جن ۲ بااثر شعبوں میں جاسکتے ہیں وہ بیوروکریسی اور فوج ہیں۔ لیکن ان شعبوں کا نظام بھی کچھ ایسا ہے کہ جب لوگ یہاں اعلیٰ عہدوں پر پہنچ جاتے ہیں تو ان کا طرزِ زندگی بھی اشرافیہ جیسا ہوجاتا ہے اور وہ بالکل نوآبادیاتی دور کے گورا صاحب بن جاتے ہیں اور یوں وہ بٹ مین، نائب قاصد اور نوکرانیوں جیسے عام لوگوں کی زندگیوں سے بالکل کٹ جاتے ہیں۔

سیاسی قوت بھی سیاسی جماعتوں میں نہیں بلکہ سیاسی شخصیات میں ہوتی ہے۔ پاکستان میں سوائے ایک مذہبی سیاسی جماعت کے یہاں کوئی جماعت ایسی نہیں جس کے سربراہ کو تبدیل کیا گیا ہو۔ یہاں مقامی سطح تک کی سیاست بھی شخصیات کی بنیاد پر ہوتی ہے، یہاں سیاستدان ان 'الیکٹیبلز' گھرانوں سے آتے ہیں جہاں ماضی میں والد اور دادا بھی منتخب ہوتے رہے ہوں۔

آخر اس بات میں کسی قسم کی حیرانی کیوں ہے کہ پاکستان کو کوئی نوبیل انعام نہیں ملا؟ ہم اپنے ایک فیصد سے بھی کم بچوں کو ہی صحیح طریقے سے تعلیم دیتے ہیں۔ ایسا ہرگز نہیں کہ ہمارے پاس باصلاحیت اور ذہین لوگ نہیں، بالکل ہیں لیکن ہمارے اکثر ذہین بچے اسکول نہیں جاتے۔ ان میں اتنی صلاحیت موجود ہوتی ہے کہ وہ ماہرِ طبعیات اور ماہرِ معاشیات کے طور پر کام کرسکتے ہیں لیکن وہ کسی نوکر یا دھوبی کے طور پر کام کررہے ہوتے ہیں۔ پاکستان ہمارے لوگوں کی صلاحیتوں اور عزائم کا قبرستان ہے۔

یونیسیف کے مطابق پاکستان میں ۵ سال سے کم عمر ۴۰ فیصد بچے جسمانی نشوونما میں ٹھہراؤ کا شکار ہیں (جو مسلسل غذائی قلت کا اشارہ ہے)، ۱۸ فیصد وزن کی کمی کا شکار ہیں (جو غذائی قلت کی وجہ سے وزن میں تیزی سے ہونے والی کمی کا اشارہ ہے) جبکہ ۲۸ فیصد بچوں کا وزن معمول کے وزن سے کم ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ ہمارے ۸۶ فیصد بچے اکثر راتوں کو بھوکے ہی سوتے ہیں۔ جنوبی ایشیا میں یہ وہ بچے ہیں

////// باقی صفحہ نمبر ۴ \\\\\\

بھارت کو سب جائز ہے!

آصف محمود

امریکا نے جتنی 'انسانی ہمدردی' یوکرین کے مسئلے پر دکھائی ہے اتنی ہمدردی کشمیر اور فلسطین کے معاملے میں کیوں نہیں دکھا رہا؟ پھر یوکرین کے مسئلے پر اس نے جس حساسیت کا مظاہرہ کیا ہے، اس حساسیت کا اطلاق وہ بھارت پر کیوں نہیں کر رہا؟

امریکا کی پالیسی کا یہی وہ خوفناک تضاد ہے جسے دیکھ کر رچرڈ ریویز کی بات یاد آجاتی ہے کہ ''ہم امریکی اپنی رہنمائی کے لیے واہیات باتیں کرتے ہیں اور علی الاعلان کرتے ہیں''۔ امریکی فارن پالیسی کے اسی تضاد کو ولیم بلم نے اپنی کتاب Killing Hopes میں ایک اور اسلوب میں بیان کرتے ہوئے کہا کہ:

Neither is that US' foreign policy is cruel because American leaders are cruel. It is that our leaders are cruel because only those willing to be inordinatly cruel and remorseless can hold positions in foreign policy establishment

(بات یہ نہیں کہ امریکا کی خارجہ پالیسی اس لیے بے رحم ہے کہ اس کی قیادت بے رحم ہے۔ معاملہ یہ ہے کہ ہمارے رہنما اس لیے بے رحم ہیں کیونکہ فارن پالیسی اسٹیبلشمنٹ میں صرف انہی لوگوں کو عہدہ مل سکتا ہے جو بے رحم، ظالم، ڈھیٹ اور بے شرم ہوں)۔

چنانچہ یوکرین کے معاملے میں امریکی خارجہ پالیسی کے تضادات ولیم بلم کی تنقید کی شرح بن کر سامنے آرہے ہیں۔ ایک جانب تو یوکرین کے لیے ایسی حساسیت دکھائی جا رہی ہے کہ مسلم دنیا حسرت سے سوچتی ہے کاش مسلمانوں کے معاملے میں بھی ایسی ہی حسرت دکھائی جاتی اور دوسری جانب اس حساسیت کا اطلاق بھی بھارت جیسے ملک پر نہیں ہوتا۔ یعنی یوکرین روس تنازع کے پس منظر میں جو اصول باقی دنیا پر لاگو کیے جا رہے ہیں، بھارت کو ان سے عملاً استثنیٰ دے دیا گیا ہے۔ باقی ممالک سے مطالبات ہیں کہ روس سے تعلقات نہ رکھے جائیں، روس سے تیل نہ خریدا جائے، روس سے دفاعی معاہدات نہ کیے جائیں لیکن بھارت سے ایسا کوئی مطالبہ نہیں کیا جاتا۔ چنانچہ بھارت چاہے تو روس سے تیل خرید کر اپنی معیشت کو سہارا دے لے اور چاہے تو روس سے دفاعی ساز و سامان کی خریداری کے نئے معاہدے کر لے۔ اسے امان ہے۔ اس پر نہ امریکی قیادت تنقید کرتی ہے نہ کوئی شکوہ اور نہ کوئی پابندی عائد کی جاتی ہے۔ ایسے میں ولیم بلم سرگوشی کرتے محسوس ہوتے ہیں کہ میں نے جو لکھا تھا غلط تو نہیں لکھا تھا؟

ایک طرف پاکستان ہے، جس کی ایف اے ٹی ایف کے ذریعے کمر دہری کر دی جاتی ہے اور دوسری جانب بھارت ہے جس پر CAASTA کے اطلاق کی آج تک امریکا نے بات تک نہیں کی۔ یعنی خود ہی امریکا نے ایک اصول طے کیا، خود ہی اس اصول کے عملی اطلاق کے لیے ایک قانون بنایا اور خود ہی بھارت کو اس قانون کو پامال کرنے کی آزادی دے رکھی ہے۔ CAASTA یعنی Countering America's Adversaries Through Sanctions Act امریکا کا اپنا قانون ہے، جو ڈونلڈ ٹرمپ کے دور میں پاس ہوا۔ اس کے علاوہ Russian Influence in Europe and Eurasia Act اور Ukraine Freedom Support Act جیسے قوانین بھی موجود ہیں۔ لیکن CAASTA کی اہمیت اس لیے زیادہ ہے کہ اس کا تعلق براہ راست ایران، شمالی کوریا اور روس جیسی ریاستوں پر پابندی سے ہے۔

اور ان پابندیوں میں صرف یہی ممالک شامل نہیں ہیں۔ بلکہ ان کے ساتھ تعاون کرنے والے ممالک بھی بعض صورتوں میں اس کی زد میں آسکتے ہیں۔ وہ صورتیں بھی ان قوانین میں بیان کر دی گئی ہیں۔ اور ان میں سے ایک شکل یہ ہے کہ ''روس کے ساتھ کوئی دفاعی معاملہ کرنا''۔ اب جب کہ روس یوکرین پر حملہ آور ہے اور امریکا اور مغربی دنیا اپنے سفید فام بھائیوں کی بقا کے لیے نئے اصول لے کر میدانِ عمل ہے، جو اصول کبھی بھی کشمیر یا فلسطین کے لیے بروئے کار نہیں لائے جاتے تو سوالات کا پیدا ہونا تو فطری امر ہے۔ مگر اس سے بھی بڑا سوال یہ ہے کہ یوکرین کے لیے بھی جو ضابطے بنائے گئے ہیں ان کا اطلاق بھارت پر نہیں کیا جا رہا۔

حال ہی میں بھارت کا روس کے ساتھ سپر سانک کروز میزائل کا معاہدہ ہوا ہے، جو ایٹمی حملہ کرنے کی بھی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس منصوبے کی مالیت پانچ ارب ڈالر ہے۔ یہ منصوبہ باہمی اشتراک سے آگے بڑھے گا۔ بھارت کا حصہ ساڑھے پچاس فیصد اور روس کا حصہ ساڑھے ۴۹ فیصد ہوگا۔ اس ایک فیصد کے فرق میں بھی جہاں معنی ہے اگرچہ علامتی سا ہی ہے۔ یہ اس بات کا اعلان ہے کہ اس منصوبے میں بھارت صرف برابر کا نہیں، تھوڑا زیادہ برابر کا شریک ہے۔ مگ فائٹر اور براہموس میزائل کے معاملات اس سے الگ ہیں۔ یہی نہیں بلکہ بھارت روس سے ۸۷ لاکھ بیرل یومیہ کے حساب سے آئل خرید رہا ہے۔ امکان ہے کہ وہ اس وقت روسی تیل کا سب سے بڑا خریدار بن چکا ہے۔ یوکرین پر حملے کے بعد یہ دونوں کام غیر معمولی نوعیت کے ہیں۔ امریکا کی جانب سے اس پر ردعمل آنا ایک فطری سی بات تھی لیکن ہمیں یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ امریکا اس بارے میں خاموش ہے۔ یعنی ایک تو اصولوں کے تعین میں تضاد ہے۔ مسلمانوں کا لہو بہہ رہا ہو تو امریکا اور مغرب کا ردعمل اور ہوتا ہے اور جب ان کے اپنے سفید فاموں کا لہو بہنے لگے تو ان کا ردعمل بالکل اور نوعیت کا ہوتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ جو اقدامات یوکرین کے حوالے سے اٹھائے گئے ہیں ایسے اقدامات کشمیر یا فلسطین کے حوالے سے نہیں اٹھائے جاتے۔

دوسرا یہ کہ ان اصولوں کا اطلاق بھی بھارت جیسے ممالک پر نہیں کیا جاتا۔ گویا بین الاقوامی قانون ہو یا اپنا قانون، امریکا کسی کو بھی اپنے مفاد کے لیے نظر انداز کر سکتا ہے۔ یہ کوئی آج کا رویہ نہیں، یہ امریکا کی پالیسی کا بنیادی اصول رہا ہے۔ سابق سیکرٹری آف اسٹیٹ ڈین ایچیسن نے کہا تھا: ''امریکا بین الاقوامی قانون کا پابند نہیں ہے۔ بین الاقوامی قانون جائے جہنم میں، مجھے کوئی پروا نہیں کہ بین الاقوامی قانون کے ماہرین کیا کہتے ہیں''۔ امریکا کے اسی رویے کو بیان کرتے ہوئے سابق اسسٹنٹ سیکرٹری آف اسٹیٹ جان آر بولٹن نے کانگریس کی کمیٹی برائے بین الاقوامی تعلقات کے سامنے تحریری بیان دیتے ہوئے یہ موقف اختیار کیا کہ ''معاہدوں کی نوعیت محض سیاسی ہوتی ہے اور قانونی اعتبار سے ان پر عمل کرنا ضروری نہیں ہوتا''۔

معاہدہ ہو یا قانون ہو، امریکا نے کبھی کسی کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ چنانچہ آج اگر اس کا مفاد بھارت سے وابستہ ہے تو اسے اس بات کی کوئی پروا نہیں ہے کہ اس کے اپنے قوانین کیا ہیں اور ان قوانین کی روشنی میں بھارت کہاں کھڑا ہے۔ جس کی گردن مروڑنی ہوگی، ان قوانین کے تحت مروڑ دی جائے گی اور جس سے صرفِ نظر کرنا ہوگا، کر لیا جائے گا۔

سوال مگر یہ ہے کہ امریکا کا دہرا رویہ جنوبی ایشیا میں سیکورٹی کے کیسے سنگین مسائل کو جنم دے سکتا ہے۔ امریکا اور مغربی دنیا کو اس خطرے کا احساس ہے یا نہیں، سوال یہ ہے کہ ہمیں خود کتنا احساس ہے؟

(بحوالہ: روزنامہ ''۹۲ نیوز'' کراچی۔ ۹ نومبر ۲۰۲۲ء)

گوانتاناموبے کا طویل ناانصافی پر مبنی قیدی

Andrew Mitrovica

گوانتاناموبے میں ۱۹ سال قید میں گزارنے کے بعد سیف اللہ پراچہ کو رہا کر دیا ہے۔ ان پر کوئی جرم ثابت نہ ہوا لیکن اس پر سیف اللہ پراچہ سے معذرت بھی نہ کی گئی۔ میں اس پیش رفت کو ایک ایسا اشتعال انگیز انجام سمجھتا ہوں، جس میں ایک پُرخوف زندگی کو ایک عجیب وغریب تجسس میں محدود کر دیا گیا ہے۔ یہ سب کچھ پاکستان سے تعلق رکھنے والے ۷۵ سالہ تاجر سیف اللہ کے ساتھ ہوا ہے، جنھیں اس سال اکتوبر میں امریکا کی سرپرستی میں چلنے والے قیدخانے (dungeons) گوانتاناموبے سے رہا کر دیا گیا ہے۔

سیف اللہ پراچہ کی رہائی کے بعد متعدد اخباری تنظیموں نے مشاہدہ کیا کہ وہ وہاں پر قید معمر ترین قیدی تھے اور انھیں وہاں قید میں ایک لمحہ بھی نہیں گزارنا چاہیے تھا، کیوں کہ امریکی حکام ان کے بارے میں کوئی ایک ایسا ثبوت تلاش نہ کر سکے جو انھیں مجرم ثابت کرنے کے لیے جواز فراہم کر دیتا۔

سیف اللہ پراچہ کو ۱۹ سال ایسے قیدخانے میں رکھا گیا جسے سی فرنٹ کمپاونڈ کہا جاتا ہے۔ وحشت انگیز روایتی قیدخانوں کے برعکس جہاں عام طور پر خاردار آہنی باڑیں، رکھوالی پر مامور کتے اور مسلح امریکی فوجیوں سے لیس پوسٹیں ہوتی ہیں، یہ قیدخانہ سیاحوں کے لیے ایک ایسی پُرکشش تفریح گاہ کا منظر پیش کرتا ہے جہاں غروب ہوتا سورج سمندر کا بوسا لیتا دکھائی دیتا ہے۔ سیف اللہ پراچہ کی رہائی کو جو چیز خبریت فراہم کرتی ہے، وہ گوانتاموبے میں موجود ان کے بارے میں بے ضابطگی کا رویہ ہے کیوں کہ وہاں زیادہ تر ایسے قیدی ہیں جو اُن سے بہت کم عمر ہیں۔

یہ نہ صرف ایک کھلی حقیقت ہے کہ سیف اللہ پراچہ کے قریباً ۲۰ سال ایک ایسے قید خانے میں ضائع کر دیے گئے جو اغوا کاری کے گھناؤنے کام کی وجہ سے بدنامِ زمانہ ہے بلکہ اس طویل عرصے میں امریکی اغوا کاروں اور جیلروں نے انھیں کسی جرم کا مرتکب بھی قرار نہ ٹھہرایا۔ اس خوف زدہ صورت حال کی ذمے داری اس عرصے میں منتخب ہونے والے امریکی صدور پر یکساں طور پر عائد ہوتی ہے جنھوں نے اس کمزور، معمر شخص اور اس کے خاندان کے ساتھ ایک لمحے کے لیے بھی افسوس کا اظہار نہ کیا۔

سیف اللہ پراچہ پر الزام یہ تھا کہ وہ نہ صرف القاعدہ کے ہمدرد ہیں بلکہ انھیں مالی مدد بھی فراہم کرتے ہیں۔ بی بی سی کے مطابق جھوٹ (weasel words) پر مبنی یہ دو مشہور الفاظ یا موقف یعنی 'القاعدہ سے تعلق' اور 'مالی مدد کی فراہمی' استعمال میں لائے گئے جنھیں سرکارِ امریکا کسی فرد کو ملوث قرار دینے کے لیے استعمال کرتی رہی۔ ان الفاظ کے علاوہ ایک اور لفظ دہشت گردی ہے جو بلاثبوت بہ کثرت استعمال میں لایا گیا۔

جولائی ۲۰۰۲ء میں ایف بی آئی کے ایک جاسوس نے سیف اللہ پراچہ کو تھائی لینڈ کا سفر اختیار کرنے پر کامیابی سے آمادہ کیا جہاں سے ان کو اغوا کر کے افغانستان لے جایا گیا، جو عالمی قوانین کی کھلی خلاف ورزی تھی۔ انھیں بگرام میں موجود ایک امریکی قیدخانے میں رکھا گیا، جہاں ان کا کسی سے رابطہ نہ رہا۔ اس دوران انھیں پہلی مرتبہ دل کا دورہ پڑنے کا سامنا کرنا پڑا۔ القاعدہ کو مالی مدد فراہم کرنے یا اس کے مفادات کی ترجمانی کرنے جیسے الزامات کے بارے ثبوت فراہم کیے بغیر ۱۴ مہینے بعد ان کے چہرے کو ڈھانپ کر اور بیڑیاں ڈال کر انھیں گوانتاموبے لے جایا گیا۔

۲۰۰۵ء میں سیف اللہ پراچہ کے نیویارک میں رہائش پذیر بیٹے عذیر کو گرفتار کیا گیا اور تیس سال قید کی سزا اس جرم کے ارتکاب میں دی گئی کہ عذیر نے دہشت گردی کے لیے مادی مدد فراہم کی تھی۔ ۱۳ سال بعد ۲۰۱۸ء میں امریکی فیڈرل کورٹ کے جج نے ان کی رہائی کا حکم دیا۔ امریکی صدور نہ صرف احتساب سے محفوظ ہیں بلکہ یہ شرم سے بھی عاری ہیں۔ میرا نہیں خیال کہ جارج ڈبلیو بُش، بارک اوباما اور ڈونلڈ ٹرمپ، سیف اللہ پراچہ کو جانتے تھے اور ان کے ساتھ برتاؤ سے بھی باخبر تھے کیونکہ امریکا کے کمانڈر اِن چیف بننے کا پہلا اصول یا پہلی شرط یہ ہے کہ قومی مفاد کے دفاع میں امریکی فوج کو مخالف افراد کو نقصان پہنچانے اور جان سے مارنے کے لیے بھیجا جائے۔

اس عرصے میں سیف اللہ پراچہ اُن افراد کی قید میں رہے، جو اپنے صدارتی کتب خانوں کی وجہ سے مشہور ہیں۔ جبکہ پراچہ سے متعلق کسی فرد کو نقصان پہنچانے یا قتل کرنے کا الزام بھی نہیں۔ سیف اللہ پراچہ کے بارے خاص طور پر بارک اوباما کا رویہ شرم ناک رہا۔

۲۰۱۰ء میں امریکی صدر کے حکم کے مطابق ایک ٹاسک فورس بنائی گئی جس نے صدر کو بتایا کہ گوانتاموبے میں موجود کچھ قیدیوں کے بارے میں ثبوت حاصل نہیں ہو سکے ہیں لیکن ان قیدیوں کو رہا کر دیا جائے تو یہ بہت خطرناک ہو سکتے ہیں۔ ۲۰۱۳ء میں یہ معلومات سامنے آئیں کہ سیف اللہ پراچہ کا شمار ان ۱۷ قیدیوں میں ہوتا ہے جن کے خلاف کسی جرم کے شواہد موجود نہیں۔ اس موقع پر ایک بار پھر دیانت پر سیاست غالب آ گئی۔ اوباما نے رہائی کے بجائے ایک ایسے بیمار فرد کو قید میں رکھنے کو ترجیح دی جس کا خاندان پاکستان میں ان کی رہائی کا منتظر ہے۔

سیف اللہ پراچہ کی اس طویل قید کے حوالے سے سب سے زیادہ افسوسناک بات یہ تھی کہ وہ بطور تاجر امریکا میں ۱۹۷۰ء سے رہنے اور کام کرنے کا تجربہ رکھتے تھے۔ قید کے اس تلخ تجربے نے ہر موقع پر نہ صرف ان کی بے گناہی کو ثابت کر دیا بلکہ ان کی اس نئے ملک سے پیار اور احسان مندی کو بھی عیاں کیا ہے۔ بدلے کے پیاسے اور متشدد کالم نگاروں نے امریکا کو اکسایا تھا کہ وہ عراقیوں پر حملے کرے اور انہی کالم نگاروں نے کابل، بغداد اور دیگر جگہوں پر 'دہشت گردوں' کے تعاقب کے لیے بھی امریکا کو اکسایا۔

سیف پراچہ کی گرفتاری اس بات کا اظہار ہے کہ ریپبلکن اور ڈیموکریٹ دونوں مستقبل میں اپنے وطن کو محفوظ رکھنے کے لیے کتنے ظالم ہو سکتے ہیں۔ اس حوالے سے نہ کوئی قانون کی عملداری کو پوچھتا ہے نہ بین الاقوامی قوانین کو، نہ ہی امریکی آئین میں فراہم کیے گئے حقوق اور نہ شفافیت کو اور ظاہر ہے کہ نہ ہی سیف اللہ پراچہ کو۔ ان کی زندگی کے قیمتی ترین برسوں کی کوئی اہمیت نہیں۔ بحیثیت شوہر، بحیثیت والد، بحیثیت بھائی، بحیثیت بیٹا ان کی کوئی اہمیت نہیں۔

اس صورت حال میں اگر سیف اللہ پراچہ اور ان کے خاندان کے مصائب کی کچھ تلافی ہو سکتی ہے تو وہ غیر منصفانہ قید کے متعلق معافی نامہ ہے۔ امریکی اداروں کی جانب سے معافی نامہ جاری ہونا چاہیے لیکن وہ نہیں ہوگا۔ امریکی صدور سیف اللہ پراچہ جیسے فرد سے معافی نہیں مانگیں گے۔ اس سے ان صدور اور دفترِ صدر کا رتبہ کم ہوتا ہے۔ یہ بات اہم ہے، سیف اللہ پراچہ اہم نہیں۔

سیف اللہ پراچہ کی حالیہ دنوں کی ایک تصویر ظاہر کرتی ہے کہ وہ اب بھی انسانیت کے لیے پُرعزم ہیں اور شاید اُن کی

////// باقی صفحہ نمبر ۱۰ \\\\\\

آبادیاتی تبدیلی کے یورپی سیاست پر اثرات

عائشہ اعجاز خان

رواں سال کنزرویٹیو پارٹی کی سربراہی کی دوڑ میں رشی سوناک کو لزٹرس سے شکست ہوگئی تھی، تاہم اب وہ برطانیہ کے نئے وزیراعظم بن چکے ہیں۔ اس امر نے برطانیہ کی سیاست میں رنگ و نسل اور مذہب پر نئی بحث چھیڑ دی ہے۔

برطانیہ کے پہلے ہندو اور غیر سفید فام وزیراعظم ہونے کی حیثیت سے رشی سوناک دنیا بھر کی توجہ کا مرکز بن گئے ہیں۔ ان کا موازنہ امریکا کے پہلے سیاہ فام صدر باراک اوباما سے کیا جاتا ہے۔ لیکن ان دونوں کے درمیان مماثلت کم اور فرق زیادہ نظر آتا ہے۔

کینیا سے تعلق رکھنے والے باراک اوباما کے والد ان کی زندگی میں کم ہی رہے اور اوباما کو ان کی سفید فام امریکی والدہ نے پالا۔ مخلوط نسل کے باراک اوباما سفید فام اور سیاہ فام لوگوں سے یکساں تعلق رکھ سکتے ہیں، اور سیاہ فاموں کے ساتھ ان کا تعلق ان کی اہلیہ مشیل اوباما کی وجہ سے مزید مضبوط ہوا، جن کا تعلق امریکی سیاہ فام برادری سے ہے۔

ایک وکیل اور کمیونٹی آرگنائزر کی حیثیت سے ڈیموکریٹک پارٹی میں اوباما کے ابھرنے اور انتخابات میں جیت کے بعد ۸ سال تک صدارت کے عہدے پر فائز رہنے کو ان کی ذاتی کشش اور شخصیت کا اثر قرار دیا جاسکتا ہے۔

دوسری جانب رشی سوناک کی بات کی جائے تو ان کے بارے میں اویناش پالیوال نے ''انڈین ایکسپریس'' میں لکھا ہے کہ وہ 'ایک حادثاتی وزیراعظم ہیں'۔ ان کی پارٹی نے چند ماہ قبل انہیں پارٹی لیڈر کے طور پر رد کردیا تھا کیونکہ ان کی ذاتی مقبولیت کم تھی اور کنزرویٹیو پارٹی کی روایات کے مطابق، رشی سوناک کی ذات اور مذہب کی وجہ سے ان کی سربراہی میں کنزرویٹیو پارٹی کے لیے انتخابات جیتنا مزید مشکل ہوجاتا۔ اس کے باوجود جب لزٹرس نے بطور وزیراعظم غیر تسلی بخش کارکردگی کا مظاہرہ کیا اور انہیں ۴۵ دن بعد ہی وزیراعظم کا عہدہ چھوڑنا پڑا تو رشی سوناک کو ایک اور موقع مل گیا۔

اب تارکینِ وطن کی مخالف پارٹی کو مشرقی افریقا سے تعلق رکھنے والے تارکینِ وطن کا بیٹا چلا رہا ہے۔ اوباما کی طرح، رشی سوناک کے والد بھی کینیا میں پیدا ہوئے۔ اوباما عیسائی مذہب پر عمل پیرا تھے، ان کے برعکس رشی سوناک کا تعلق ہندو مذہب سے ہے۔ ان کی اہلیہ اکشتا مورتی بھارتی شہری ہیں جن کے پاس برطانوی شہریت نہیں ہے۔ چونکہ وہ ایک ارب پتی باپ کی بیٹی ہیں اس لیے انہیں برطانوی شہریت نہ لینے سے برطانیہ میں ٹیکسوں کی ادائیگی سے بچنے میں مدد ملی۔ ان دونوں کی مجموعی دولت ۸۰ کروڑ ڈالر ہے جو انہیں برطانیہ کے بادشاہ چارلس سے بھی زیادہ امیر بناتی ہے۔ لیکن کوئی چیز بھی رشی سوناک کو نسل پرستوں کے لیے قابلِ قبول نہیں بناتی۔ سوشل میڈیا پر وائرل ہونے والے ایل بی سی پوڈکاسٹ کے ایک کلپ نے اس بات کو کافی حد تک واضح کردیا ہے۔

اس کلپ میں جیری نامی کالر، جو کہ کنزرویٹیو پارٹی کے بورس جانسن کے حامی تھے، نے افسوس کے ساتھ کہا کہ، 'کوئی بھی مجھے پاکستان یا سعودی عرب کا وزیراعظم نہیں بنائے گا پھر کیوں رشی سوناک جیسے اس قدر مختلف شخص کو برطانیہ چلانے کی اجازت دی جارہی ہے؟'

پوڈکاسٹ کی میزبان سنگیتا مسکا نے اصرار کیا کہ چونکہ رشی سوناک برطانیہ میں پیدا ہوئے ہیں اس لیے انہیں وزیراعظم بننے کا پورا حق حاصل ہے۔ لیکن جیری نے اس بات سے اتفاق نہیں کیا اور کہا کہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ آپ کہاں پیدا ہوئے ہیں۔ جیری نے اپنے ساتھی کا ذکر بھی کیا جو یوگانڈا میں پیدا ہوا لیکن وہ اسی کی طرح انگریز ہے اور اس نے جیری کے ساتھ فوج میں بھی اپنی خدمات انجام دی ہیں۔ اس کے بعد سنگیتا نے جیری کی حب الوطنی کو صرف سفید فاموں کے لیے مخصوص کردینے کے خیال پر سوال کیا جس پر جیری نے کوئی تکرار نہیں کی۔

یقینی طور پر جیری جیسے لوگ ہر جگہ موجود ہیں۔ امریکا میں انہوں نے ہی دوسری نسل کے لوگوں سے نفرت کی تحریک 'میک امریکا گریٹ اگین' کو ہوا دی، جس کی قیادت ڈونلڈ ٹرمپ کررہے تھے۔ اس تحریک کو باراک اوباما کے ۲ ادوار حکومت کے بعد ان حلقوں میں پیدا ہونے والے تعصب نے ہوا دی۔

لیکن یقین جانیے کہ جیری اور اس جیسے دیگر لوگ ہاری ہوئی لڑائی جیتنے کی کوشش کررہے ہیں۔ تارکینِ وطن افراد نے مغربی ممالک کی معیشت میں کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ جو مہاجر جتنا نیا ہوگا وہ اتنی ہی محنت سے کام کرے گا۔ دائیں بازو کی جانب سے ایمیگریشن کو 'ہزاروں' کی تعداد تک محدود کرنے کے مطالبے کے باوجود کسی حکومت کے لیے ایسا کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کاروبار چلانے کے لیے تارکینِ وطن افراد پر انحصار کیا جاتا ہے۔ برطانیہ کو بیرونِ ملک سے ہزاروں لاکھوں مزدوروں کی ضرورت ہے۔

قدرتی طور پر ترکِ وطن، آبادیاتی تبدیلیوں کا سبب بنتا ہے اور جمہوریت کی خوبصورتی یہ ہے کہ وہ سب کو نمائندگی کی اجازت دیتی ہے۔ اگرچہ رشی سوناک کے پاس عام انتخابات میں کھڑے ہونے کے لیے کوئی حلقہ نہیں ہوگا لیکن تارکینِ وطن والدین کی کئی اولادیں ہوں گی جو اپنے حلقوں کی نمائندگی کریں گے اور اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوں گی۔

کینیڈا کے وزیراعظم جسٹن ٹروڈو کی کابینہ میں مسلمان اور سکھ دونوں موجود ہیں۔ برطانیہ میں پاکستانی تارکینِ وطن کے بیٹے صادق خان ۲۰۱۶ء سے لندن کے میئر ہیں۔ اس کے علاوہ ساجد جاوید ہوم سیکریٹری اور خزانے کے چانسلر کے عہدوں پر رہ چکے ہیں۔ شمالی افریقا سے تعلق رکھنے والے مسلمان تارکینِ وطن کی بیٹی رشیدہ داتی نے فرانس میں وزیر انصاف کے طور پر کام کیا۔ احمد ابوطالب جو مراکش کے چھوٹے سے گاؤں میں واقع مسجد کے امام کے بیٹے ہیں اور ۱۵ سال کی عمر میں نیدرلینڈ ہجرت کر گئے تھے، اس وقت روٹرڈیم کے میئر کے طور پر خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔

آبادیاتی تبدیلیوں کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کے لیے سیاسی عہدوں کے حصول کے لیے انتخابات لڑنا آسان ہو جائے گا اور ایسا امریکا سے کہیں زیادہ یورپ میں ہوگا۔ مثال کے طور پر برسلز کی ۲۵ فیصد آبادی مسلمان ہے، فرانس کے کچھ حصے، جیسا کہ سینٹ ڈینس میں یہ تناسب ۴۵ فیصد تک ہے۔ لندن میں ۱۴ فیصد جبکہ بریڈفورڈ میں یہ تناسب ۲۵ فیصد ہے۔

یقیناً یہ آبادیاتی تبدیلی کچھ لوگوں کو پسند نہیں آئے گی اور شاید اس بنیاد پر نسلی تعصب میں اضافہ بھی ہو لیکن اس طویل مدتی دوڑ میں تارکینِ وطن ہی جیتیں گے۔

"Sunak's rise to PM".
(Daily "Dawn" Karachi. October 29, 2022)

سیرتؐ کے موضوع پر اسلامک ریسرچ اکیڈمی کی شائع کردہ کتاب
اوّل صدارتی ایوارڈ یافتہ
سیرتِ سید الابرار ﷺ
قیمت: ۱۲۰۰ روپے
اکیڈمی بک سینٹر۔ فون: 021-36809201

MA'ARIF FEATURE - Publisher:Shahid Hashmi; Printer:Hassan M.Abbasi,City Press,Karachi; Office:D-35,Block-5,F.B.Area,Karachi-75950